نومبر ۸۸ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

★ پاکستانی مسلمانوں کے دینی فرائض

ایک نئے پہلو سے جائزہ ـــــ امیر تنظیم اسلامی کا خطاب

★ اللہ اور رسول کی اطاعت ـــ ایک فکر انگیز تحریر

یکے از مطبوعات

تنظیم اسلامی

نام بھی اچھّا — کام بھی اچھّا
صُوفی سوپ ہے سب سے اچھّا

صُوفی سوپ

اُجلی اور کم خرچ دُھلائی کے لیے بہترین صابن

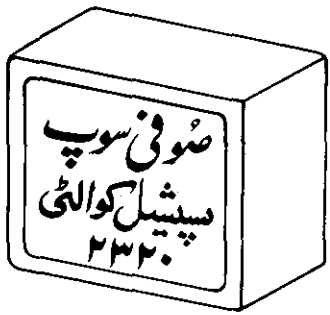

صُوفی سوپ اینڈ کیمیکل انڈسٹریز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

تار: صُوفی سوپ
ٹیلکس:
۳۹۔ فلیمنگ روڈ، لاہور۔ ٹیلی فون نمبر: ۲۲۵۴۴۷-۵۴۵۲۳

اِن شَاءَ اللہُ العَزِیز وبعونہٖ تعالےٰ

انجمن خُدّامُ القرآن سندھ کراچی

کے زیرِ اہتمام

۱۷ تا ۲۱ دسمبر ۸۸ء ریکس آڈیٹوریم صدر کراچی میں

اسلام کا نظامِ حیات

کے موضوع پر محاضراتِ قرآنی منعقد ہوں گے جن میں روزانہ بعد نمازِ مغرب

ڈاکٹر اسرار احمد

صدر مؤسس، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ــــ وامیر تنظیمِ اسلامی

● اسلامی نظام کی نظریاتی اساس

● اسلام کا اخلاقی و روحانی نظام ● اسلام کا سماجی و معاشرتی نظام

● اسلام کا سیاسی و ریاستی نظام اور ● اسلام کا معاشی و اقتصادی نظام

کے موضوع پر خطاب فرمائیں گے اور متعلقہ سوالات کے جواب دیں گے

ع "صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے!"

المعلن: (سید) سراج الحق، صدر، انجمن خدام القرآن سندھ

D-56، بلاک بی، نارتھ ناظم آباد، کراچی (فون :- ۶۲۴۴۵۰)

ــــ پشت پر بھی ملاحظہ فرمائیں ــــ

ان شاء اللہ العزیز وبعونہٖ تعالیٰ

انجمن خدّام القرآن کے قرآنی محاضرات کے ساتھ ساتھ

ریکس آڈیٹوریم کراچی ہی میں ۱۷ تا ۲۲ دسمبر ۱۹۸۸ء

تنظیمِ اسلامی کی مرکزی تربیت گاہ

بھی منعقد ہو گی، جس میں

★ قرآن حکیم کے دعوتی اور تربیتی نصاب اور

★ تزکیۂ نفس کے اصول و مبادی، کے علاوہ

★ موجودہ حالات میں اسلامی انقلاب کا طریق و منہاج، اور

★ دعوت و تنظیم کی راہ کی مشکلات اور اُن کا حل

ایسے اہم موضوعات پر مذاکرات ہوں گے

تنظیمِ اسلامی کے رفقاء ابھی سے رخصت وغیرہ کا بندوبست شروع کر دیں اور زیادہ سے زیادہ ۱۷ دسمبر ۸۸ء کی سہ پہر تک ضرور کراچی پہنچ جائیں۔ وہاں سے واپسی کے لیے جمعرات ۲۲ دسمبر کی بعد دوپہر بکنگ کرائی جائے۔ قیام گاہ وغیرہ کے ضمن میں تفصیلی اطلاع 'میثاق' کے آئندہ شمارے میں شائع کر دی جائے گی۔

المعلن: (میاں) محمد نعیم، ناظمِ اعلیٰ، تنظیمِ اسلامی پاکستان

۶۷۔اے، علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور

(فون:۔ ۳۰۵۱۱۰)

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد	۳۷
شمارہ	۱۱
ربیع الاوّل	۱۴۰۹ھ
نومبر	۱۹۸۸ء
فی شمارہ	۵/-
سالانہ زرتعاون	۵۰/-

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

ادارۂ تحریر

اقتدار احمد

شیخ جمیل الرحمٰن

حافظ عاکف سعید

حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

سعودی عرب، کویت، دوبئی، دوہا، قطر، متحدہ عرب امارات	۲۵ سعودی ریال
ایران، ترکی، اومان، عراق، بنگلہ دیش، الجزائر، مصر، انڈیا	۶- امریکی ڈالر
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک، جاپان وغیرہ	۹- امریکی ڈالر
شمالی وجنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ	۱۲- امریکی ڈالر

ترسیل زر: ماہنامہ میثاق لاہور یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ ماڈل ٹاؤن برانچ ۳۶- کے ماڈل ٹاؤن لاہور - ۱۴ (پاکستان)، لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶- کے ماڈل ٹاؤن لاہور - ۱۴ فون: ۸۵۶۰۰۴

سب آفس: ۱۱- داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی۔ فون: ۲۱۶۵۸۶

پبلیشرز: لطف الرحمٰن خان مقامِ اشاعت: ۳۶- کے ماڈل ٹاؤن۔ لاہور

طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس شارع فاطمہ جناح لاہور

(نوٹ) خط وکتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر فرمائیں

مشمولات

عرضِ احوال ———— ۵
اقتدار احمد

الہدیٰ (نشست ۵۵) ———— ۹
مسلمانوں کی سیاسی و ملّی زندگی کے رہنما اصول (قسط ۲)
ڈاکٹر اسرار احمد

ایک پنتھ 'تین' کاج ———— ۱۹
پاکستانی مسلمانوں کے دینی فرائض کا ایک نئے پہلو سے جائزہ
ڈاکٹر اسرار احمد کا خطابِ جمعہ

حقیقتِ جہاد (۲) ———— ۲۵
ڈاکٹر اسرار احمد

اللہ اور رسولؐ کی اطاعت ———— ۴۷
مختار حسین فاروقی

مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی شخصیت اور مولانا ابوالکلام کے بارے میں ان کے تأثرات ———— ۵۹
مولانا محمد اسحاق بھٹی

ختمِ نبوّت اور علاّمہ محمد اقبال ———— ۷۳
سیّد شبّیر حسین شاہ زاھد

تنظیمِ اسلامی کی پالیسی بسلسلہ انتخابات ———— ۸۷
ادارہ

رفتارِ کار ———— ۸۹

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اقتدار احمد

عرض احوال

پچھلے ہی شمارے میں امیر تنظیم اسلامی 'ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے دو خطبات کے ماحصل کو یک جا کر کے شائع کیا گیا تھا' جن میں انہوں نے قومی سیاست کی موجودہ صورت حال اور بالخصوص آئندہ عام انتخابات کے تناظر میں ملک کی سیاسی اور مذہبی جماعتوں کو کچھ مشورے دیئے اور یہ سب کچھ فی الحقیقت تمہید تھی' اس عاجزانہ درخواست کی جو انہوں نے جماعت اسلامی کی خدمت میں پیش کی کہ اب بھی وقت ہے کہ وہ اسی اصولی اسلامی انقلابی جماعت کا کردار ادا کرنے کا فیصلہ کر لے' جو اس کے بنیادی اصولوں' تنظیمی ڈھانچے اور مزاج کی ساخت سے قریب تر ہے۔ گذشتہ اکتالیس سالوں میں اس نے یہاں کی انتخابی سیاست میں حصہ لے کر نہ ملک کے حق میں بہتری کی کوئی شکل پیدا کی اور نہ اسلام کی کسی درجے میں کوئی خدمت ہو سکی۔ رائج الوقت سیاست کے آنے والے معرکے میں وہ اپنی سب توانائیاں بھی جھونک دے تو اسمبلیوں میں گنتی کی چند سیٹیں جیت لینے سے بڑا کارنامہ انجام نہ دے سکے گی' جو اسلامی انقلاب کی راہ ہموار کرنے کے سلسلے میں تو کسی مثبت پیش رفت کا باعث ہرگز نہ ہو گا البتہ اسلام کی منزل ضرور کھوٹی ہو گی۔

افسوس کہ ایک درد مند بہی خواہ کے دل سے نکلی یہ آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی اور جماعت کی قیادت نے ان چند ہفتوں کے دوران میدان سیاست میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہ ہمارے روایتی طالع آزما سیاست دانوں کی بازی گری کو بھی پیچھے چھوڑ گئے جماعت کی اپنی اب تک کی سب ادلتی بدلتی انتخابی حکمت عملیاں بھی گرد ہو گئیں اور المیہ یہ ہے کہ اب وہ ایسے مقام پر آپہنچی ہے جہاں سے واپسی کی توقع ایک معجزہ ہی قرار دی جا سکتی ہے۔ اس بار وہ اپنے انتخابی سیاسی عمل کی اس انتہا کو چھونے کا فیصلہ کر چکی ہے جو قبل ازیں شاید اس کے اپنے وہم و گماں میں نہ تھی۔ ملک کے اولین عام انتخاب (پنجاب کے صوبائی الیکشن منعقدہ ۱۹۵۱ء) میں "ووٹر کے عہد نامہ" اور "اسلامی پنچایت" سے آغاز کر کے جس میں

امیدواری پوری صراحت کے ساتھ حرام تھی اور پارٹی ٹکٹ ایک لعنت' ۱۹۸۸ء کے انتخابات میں اپنے موجودہ مقام تک کا فاصلہ طے کرنے میں اسے دوچار نہیں' ان گنت سخت مقامات سے گذرنا پڑا ہے' جن کی تفصیل کا بیان ہمارے لئے دلچسپی کا سامان نہیں' صدمے کی بات ہے۔ ہمارے قارئین کو تو کیا' خود جماعت اسلامی کی نئی نسل کو ہماری یہ بات شاید ایک چیستاں معلوم ہو اور کیوں نہ ہو' فرق وتفاوت اتنا زیادہ ہے کہ تخیل کی حدوں کو پھلانگ جاتا ہے اور مرور ایام نے اس پر اتنے پردے ڈال دیئے ہیں کہ یاد ماضی کو باقاعدہ کریدنا پڑتا ہے لیکن جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے یہ حکایت دراز تو ہے' لذیذ نہیں۔ نصف صدی کا قصہ ہے' دوچار برس کی بات نہیں۔ اس کے لئے یہ چند صفحات کافی بھی نہیں ہوں گے۔ کسی کو فرصت ہو تو اس کی تاریخ پر ایک پوری کتاب لکھی جانی چاہئے' جو دین کے کام کا داعیہ لے کر اٹھنے والی جماعتوں کے لئے داستان عبرت بھی ہوگی اور اس راہ عزیمت کی ان کھائیوں کی نشاندہی بھی' جن سے بچ کر نکلنا منزل مراد پانے کے لوازم میں شمار کی جائے گی۔ اس کے آخری باب کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے ہی جگر تھامنا پڑتا ہے۔

قاضی حسین احمد صاحب' امیر جماعت اسلامی نے اپنے ایک اہم وضاحتی بیان میں فرمایا' جس کا متعلقہ حصہ ہفت روزہ "ایشیا" (۲۷ر اکتوبر) سے نقل کیا جارہا ہے' لہٰذا اس کی صحت پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے کہ.....

"اس (اسلامی جمہوری) اتحاد میں شامل ہونا جماعت کے لئے ایک مشکل فیصلہ تھا۔ لیکن ملکی حالات کے پیش نظر اور قومی انتخابات کو یقینی بنانے کے لئے ہم نے اس اتحاد میں شامل ہونا ضروری سمجھا اور جماعت کے مشاورتی نظام نے تمام مراحل طے کر کے یہ فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ کرتے وقت ہماری راہ میں اگرچہ کئی مشکلات حائل تھیں لیکن ہم نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ اس اتحاد میں شامل ہونا چاہئے کیونکہ ملک کو بحران سے نکالنے کے لئے اس کے سوا کوئی اور متبادل راستہ نہیں ہے۔

پاکستان عوامی اتحاد کے نام سے بھی ایک دوسرا سیاسی اتحاد بنا لیکن مسئلہ افغانستان کے بارے میں اس کے روس نواز اور بھارت نواز رجحان بالکل واضح ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ ان ممالک کے آلۂ کار ہیں لیکن اس مسئلے پر ان کا اب تک جو رویہ رہا ہے وہ جہاد افغانستان کی روح کے منافی ہے۔ اس اتحاد میں شامل ایک جماعت کے سربراہ تو افغانستان کا سرکاری دورہ بھی کر چکے ہیں اور انہوں نے اپنی پارٹی منشور میں یہ تک لکھ دیا ہے کہ پاکستان ایک سیکولر اسٹیٹ ہوگا۔

پاکستان پیپلز پارٹی کے بارے میں ہمارا مؤقف یہ تھا کہ جو جماعتیں آٹھ سال سے اس کے ساتھ ہیں وہ ان سے انتخابی اتحاد نہیں کر سکی تو اور کس پارٹی سے اس کا اتحاد ہو سکتا ہے۔"

اسلامی جمہوری اتحاد میں شمولیت مبارک کہ وہ اپنے ماضی اور اپنی ہیئت ترکیبی کے اعتبار سے نہ سہی، نام کا تو اسلامی جمہوری ہے، لیکن جہاد افغانستان کے دشمن پاکستان عوامی اتحاد کے آن ملنے پر بھی جماعت کی جبیں پر شکن نہ آئی۔ اس کے دو تہائی حصے کو "عظیم تر اتحاد" سے نکالا نہیں گیا بلکہ سیٹوں کی تقسیم سے غیر مطمئن ہو کر اسی نے ساتھ چھوڑ دیا۔ یہ حادثہ نہ ہوتا تو روس و بھارت نوازی اور جہاد افغانستان کی روح کی نفی کھلے دل سے قبول کر لی گئی تھی۔ اور پاکستان پیپلز پارٹی اگر ان جماعتوں کو ساتھ رکھ سکتی جو آٹھ سال اس کے ساتھ رہیں تو نویں سال جماعت اسلامی کو بھی اس کا اتحادی بننے پر اعتراض نہ تھا بلکہ وہ تو مفاہمت کی فضا میں اس کے ساتھ اتحاد کے موضوع پر مذاکرات شروع بھی کر چکی تھی..... اللہ، اللہ! ایک اصولی اسلامی انقلابی جماعت کو نظام اسلام کے نفاذ کی منزل سر کرنے کے لئے کن دشوار گھاٹیوں سے گذرنا پڑ رہا ہے۔

ملک کے دیگر مذہبی عناصر نے بھی اس موقع پر قابل رشک تو کیا معقول طرز عمل کا مظاہرہ بھی نہ کیا۔ محض انتخابات میں حصہ لینے کے محدود اور خالص دنیاوی (بمقابلہ دین و مذہب) مقصد کے لئے قائم ہونے والے عارضی اتحادوں اور گروہ بندیوں میں ان کی شمولیت بھی گوارا کی جا سکتی تھی بشرطیکہ اس شمولیت میں اصولوں اور نظریات کا کچھ تو عمل دخل ہوتا لیکن اخبارات کے صفحات گواہ ہیں کہ موقع شناسی اور مصلحت بینی کے اس "نیک کام" میں وہ خالص دنیاداروں پر بھی سبقت لے گئے۔ اور پھر ٹکٹوں کی تقسیم پر جس انداز کی سودے بازی ہوئی، مطلوبہ تعداد میں یا منتخب مقامات پر سیٹیں نہ ملنے پر اتحادیوں کو جیسے سب و شتم کا نشانہ بنایا گیا، "نفسی! نفسی!" کی فریاد جس طرح کانوں کے پردے پھاڑتی رہی اور افراتفری کا جو یہ عالم دیکھنے میں آ رہا ہے کہ عین پولنگ کے دن ہی معلوم ہو گا کہ کون کس کے ساتھ ہے، کون کھڑا ہے، کون بیٹھ گیا اور کھڑا ہے تو کس سہارے پر، بیٹھ گیا تو کیا لے دے کر۔ یہ سب کچھ دیکھ اور سن کر خدا یاد آتا ہے۔ ہمیں تو پہلے ہی اپنی اس رائے پر اطمینان میسر تھا کہ اس باطل نظام کی فاسد انتخابی سیاست سے دین و مذہب کا کچھ بھلا نہ ہو گا، اللہ تعالیٰ اپنے دین کی کسی درجے میں سربلندی چاہنے والوں کو اس مشاہدے کی اذیت سے گذار کر بھی یہی کچھ سمجھنے کی توفیق دے تو غنیمت ہے۔

بایں ہمہ انتخابات کی بیل گوارا حد تک امن و امان کی فضا میں منڈھے چڑھ جائے، نتائج کو اس دوڑ میں شریک سب حلقے خوش دلی سے نہیں تو مارے باندھے ہی قبول کر لیں، ملک کے آئین اور دستور زمانہ کے مطابق خیر و عافیت سے انتقال اقتدار کا مرحلہ طے پا جائے اور حزب اقتدار و حزب اختلاف دونوں ہی اپنا وہ کردار استقامت سے نبھانے کا پختہ ارادہ کر لیں جو اس طرز جمہوری کی مسلمہ روایات کا بنیادی تقاضا ہے تو ملک جمہوریت کی راہ پر گامزن تو ہو جائے گا۔ آثار جو انتخابی عمل کے آغاز پر ظاہر ہو رہے ہیں وہ اگرچہ کسی اچھے انجام کی امید نہیں دلاتے تاہم پاکستان کے ہر محب وطن مسلمان شہری کو نہایت الحاح و زاری سے اپنے رب کے حضور دعائیں کرنی چاہئیں کہ وہ ہمیں کسی اور آزمائش سے دوچار نہ کرے۔ آئندہ انتخابات اگر مطلوبہ نتائج دینے میں ناکام رہیں تب بھی اس بساط کو پھر سے لپیٹ نہ دیا جائے، بلکہ بری بھلی جمہوریت کو کام کرنے کا موقع ملنا چاہئے۔ یہ سلسلہ چلتا رہا تو ایک دو بار کے تلخ تجربات کے بعد ہی سہی، لوگ اپنی غلطیوں سے سبق سیکھ لیں گے اور کم از کم وہ صورت تو نہ رہے گی جس کی ہولناکی کے تصور سے آج ہم لرزہ براندام ہیں۔ ملک کی جغرافیائی وحدت اور قوم میں اتفاق و یکجہتی کی فضا کے لئے جو خطرات جمہوری عمل کے تعطل میں مخفی ہیں وہ اب کسی دیدۂ بینا سے پوشیدہ نہیں۔ ہم پاکستان کی وحدت و سالمیت کے طالب ہیں۔ اس کو اللہ تعالیٰ سلامت رکھیں تو یہاں اس کے دین کی سربلندی کا خواب بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

تنظیم اسلامی جمہوریت کی بحالی کی آرزومند ہے اور اس کے لئے صحیح رخ پر کی جانے والی ہر کوشش کی حمایت کرتی ہے اور کرتی رہے گی۔ ہمیں یہ تو یقین ہے کہ یہاں جمہوریت ویسی ہی آئے گی جیسے خود جمہور ہیں، لیکن یہ اطمینان بھی ہے کہ ملک خداداد سلامت رہے اور جمہوریت عوام میں معرفت نفس ہی پیدا کرنے کا باعث بن جائے تو اللہ اور اس کے دین کی طرف رجوع کی دعوت دینے میں کوئی امر مانع نہ ہو گا، کچھ سہولت ہی پیدا ہو گی۔ مسلمانوں کے اس وطن میں کیسی بھی حکومت آ جائے ہمیں اپنا کام کرنے سے نہ روکے گی اور نہ روک سکے گی، بشرطیکہ زبان و قلم پر پہرے ہی بٹھا دیئے جائیں جو جمہوری چھوڑ، نیم جمہوری حکومت سے بھی متوقع نہیں۔ "میثاق" کے آئندہ شمارے کے آنے سے بہت پہلے اللہ کو منظور ہوا تو، یہ الیکشن کا ہنگامہ سرد ہو چکا ہو گا۔ ہم ان حضرات سے بالعموم جو ہمارے فکر اور ہماری دعوت سے اتفاق رکھتے ہیں اور اپنے رفقاء سے بالخصوص دعا کی مکرر درخواست کرتے ہیں۔ وہ کسی بھی درجے میں الیکشن کے بخار میں مبتلا ہونے سے پرہیز کریں۔ اپنے اصل کام کی طرف توجہ مرکوز رکھیں اور اپنی صفوں کو مضبوط کریں۔ انتخابات کا جوش و خروش ختم ہونے پر انشاء اللہ لوگ

(باقی ص۸۲ پر)

پاکستان ٹیلی ویژن پر نشر شدہ ڈاکٹر اسرار احمد کے دروسِ قرآن کا سلسلہ

الہدیٰ

درس ۲۱ نشست ۵۵

مباحثِ عمل صالح

مسلمانوں کی سیاسی و ملّی زندگی کے رہنما اصول

سورۃ الحجرات کی روشنی میں

(۲)

السلام علیکم .... نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم .... امّا بعد

فاعوذ باللّٰہِ من الشیطٰنِ الرّجیم ــــ بسمِ اللّٰہِ الرّحمٰنِ الرّحیمْ

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ
صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْھَرُوْا لَہٗ بِالْقَوْلِ کَجَھْرِ بَعْضِکُمْ لِبَعْضٍ اَنْ
تَحْبَطَ اَعْمَالُکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝۲ اِنَّ الَّذِیْنَ یَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَھُمْ
عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ لِلتَّقْوٰی ط
لَھُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّ اَجْرٌ عَظِیْمٌ ۝۳ اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَکَ مِنْ وَّرَآءِ
الْحُجُرٰتِ اَکْثَرُھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ ۝۴ وَلَوْ اَنَّھُمْ صَبَرُوْا حَتّٰی تَخْرُجَ اِلَیْھِمْ
لَکَانَ خَیْرًا لَّھُمْ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝۵ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَکُمْ

فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ
نٰدِمِيْنَ ۝ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۭ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ
مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ
قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ
الرّٰشِدُوْنَ ۝ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

(صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْم)

''اے ایمان والو! مت بلند کرو اپنی آوازوں کو نبی کی آواز پر اور مت گفتگو کرو ان سے بلند آوازی کے ساتھ جیسے تم باہم ایک دوسرے سے گفتگو کر لیتے ہو۔ مبادا تمہارے تمام اعمال حبط ہو جائیں اور تمہیں اس کا شعور تک نہ ہو..... یقیناً وہ لوگ جو اپنی آوازوں کو اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے پست رکھتے ہیں' وہی ہیں کہ جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لئے جانچ لیا ہے۔ ان کے لئے بخشش بھی ہے اور بہت بڑا اجر بھی..... بلاشبہ وہ لوگ جو اے نبی' (صلی اللہ علیہ وسلم) آپؐ کو پکارتے ہیں حجروں کے باہر سے' ان میں اکثر ناسمجھ ہیں..... اور اگر وہ صبر کرتے یہاں تک کہ آپؐ خود اُن کے پاس تشریف لاتے تو یہ ان کے لئے کہیں بہتر تھا۔ اور اللہ بخشنے والا' رحم فرمانے والا ہے..... اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی اہم خبر لے کر آئے تو چھان بین کر لیا کرو۔ مبادا تم نادانی میں کسی قوم کے خلاف اقدام کر بیٹھو اور پھر تمہیں پچھتانا پڑے..... اور جان رکھو کہ تمہارے مابین اللہ کے رسول ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر وہؐ تمہارا کہنا اکثر معاملات میں ماننے لگیں تو تم خود مشکل میں پڑ جاؤ گے۔ لیکن اللہ نے تو ایمان کو تمہارے نزدیک محبوب بنا دیا ہے اور اُسے تمہارے دلوں میں کھبا دیا ہے..... اور تمہارے نزدیک بہت ناپسندیدہ بنا دیا ہے کفر کو بھی اور نافرمانی کو بھی اور معصیت کو بھی۔ یہی ہیں وہ لوگ جو اصل میں کامیاب ہونے والے ہیں۔ یہ فضل ہے اللہ کی طرف سے اور مظہر ہے اس کی نعمت کا۔ اور اللہ سب کچھ جاننے والا' کمالِ حکمت والا ہے۔''

معزز حاضرین اور محترم ناظرین..... یہ سورۃ الحجرات کی آیات ۲ تا ۸ ہیں، جن کی تلاوت بھی آپ نے سماعت فرمائی اور ان کا رواں ترجمہ بھی سنا۔ ان آیات میں مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ یا اُن کی حیاتِ ملّی کی شیرازہ بندی کی جو دوسری اہم بنیاد ہے، اس کا ذکر ہے۔ پہلی بنیاد جس کا ذکر اس سورۂ مبارکہ کی پہلی آیت میں ہے، دستوری اور آئینی نوعیت کی تھی کہ ایک اسلامی ریاست یا ایک اسلامی ہیئت اجتماعیہ یا ایک اسلامی معاشرہ پابند ہے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کا۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کا دائرہ وہ دائرہ ہے کہ مسلمان خواہ فرد ہو، خواہ معاشرہ ہو، خواہ پوری ملت اسلامیہ ہو، خواہ کوئی اسلامی ریاست ہو وہ اس دائرے کے اندر محدود رہے گا۔ اب اس دائرے کا ایک مرکز بھی ہے اور مرکزی شخصیت ہے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ اور مسلمانوں کی حیاتِ ملّی کی شیرازہ بندی میں جہاں اُس پہلی اصل کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے، وہ دستوری اور آئینی اصل ہے۔ وہاں دوسری بنیاد مرکزی نقطہ کی حیثیت کی حامل ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دلی محبت ہو، حضورؐ سے عقیدت ہو، حضورؐ کا ادب واحترام ہر آن ملحوظ رکھا جائے۔ آپؐ کی توقیر و تعظیم ہو۔ گویا فی الجملہ ہر مسلمان کے دل میں جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور آپؐ کی تعظیم جاگزیں ہو۔

یہ درحقیقت وہ جذباتی بنیاد ہے جس سے ہمارے تمدن اور ہماری تہذیب کا نقشہ بنتا ہے..... یہ بات ذہن میں رکھئے کہ انسان میں صرف عقل و ذہانت (INTELLECT) ہی نہیں ہے بلکہ اس میں جذبات SENTIMENTS بھی ہیں۔ اور کسی بھی معاشرے میں جہاں اس کی عقلی اور فلسفیانہ اساسات کو اہمیت حاصل ہے وہاں جذبات کے لئے بھی کوئی مرکز ضروری ہے۔ اگر کسی کے ساتھ وہ جذباتی وابستگی نہیں ہے تو دل پھٹے رہیں گے، آپس میں بُعد رہے گا۔ اور ثقافت میں کوئی یک رنگی پیدا نہیں ہو سکے گی..... مسلمانوں میں کوئی تہذیبی و ثقافتی (CULTURAL HOMOGENITY) ہم آہنگی وجود میں نہیں آسکے گی۔ یہ مطلوبہ متجانس کیفیت درحقیقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کے ذریعے سے ہی پیدا ہوتی ہے۔

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ ایک ہے اطاعت اور ایک ہے اتباع..... ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اطاعت نام ہے اس رویّہ کا کہ جو حکم ملے اُسے پورا کر دیا جائے..... اور یہ رویّہ تو اصل میں اس دستوری اور آئینی بنیاد کا جزو ہے جس پر ہم پچھلی

نشست میں گفتگو کر چکے ہیں۔ اتباع کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ جو عمل بھی اُس شخصیت سے منسوب ہو، جسے اللہ کا رسول مانا ہے، جس پر ایمان لایا گیا ہے، جس کی اللہ کے نبی و رسول کی حیثیت سے تصدیق کی گئی ہے، اب اس شخصیت کی نشست و برخاست کا، اس کی گفتگو کا، اس کے رہن سہن کا، اس کی وضع قطع اس کی تہذیب اور اس کی پوری نجی و مجلسی زندگی کا جو بھی انداز ہو، اس پورے نقشے کو اپنے سیرت و کردار میں جذب کرنا، اِس رویّہ اور اس کیفیت کا نام دراصل اتباع ہے..... اور جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

پھر یہ کہ مسلمانوں کی تہذیب اور ان کے تمدن کے جو اصل خدوخال ہیں وہ درحقیقت اسی اتباعِ رسولؐ سے وجود میں آئے ہیں..... یہ بات پیش نظر رہے کہ ہر معاشرے کو اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ جو علامہ اقبال نے ایک خاص پس منظر میں کہا ہے کہ ع "خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انسان کی نظر" ..... تو آپ اسے چاہے انسان کی کمزوریوں میں سے ایک کمزوری شمار کریں، لیکن یہ انسان کی عالمی (UNIVERSAL) کمزوری ہے کہ کوئی دل آویز اور دلنواز شخصیت ایسی ہو کہ اس سے محبت اور قلبی لگاؤ اگر ہے تو اُس معاشرے میں جو لوگ ہیں وہ پھر آپس میں ایک دوسرے سے قریب رہیں گے۔ ان کے دل کی دھڑکنوں میں ہم آہنگی ہوگی۔ انسان کی یہ ضرورت ہے کہ اس کے قلبی لگاؤ کے لئے ایسی دل آویز اور دلنواز شخصیت موجود ہو جو معاشرے کی شیرازہ بندی میں نقطۂ ماسکہ کا کردار ادا کرے۔ اُسے آپ ہیرو کہیں، آپ اُسے کسی دوسرے اعلیٰ لقب سے پکاریں لیکن واقعہ یہ ہے کہ تمام معاشروں کو یہ ہیرو باقاعدہ گھڑنے پڑتے ہیں۔ یہ شخصیتیں تراشنی پڑتی ہیں اس لئے کہ یہ ان کی ضرورت ہے۔ جذباتی وابستگی کے لئے ایک ایسا مرکز لازم ہے۔

کتنی بڑی خوش قسمتی ہے امتِ محمد کی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام.....) کہ یہاں کوئی مصنوعی شخصیت تراشنے اور گھڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے جیسا ابھی عرض کیا کہ دوسروں کو تو مصنوعی شخصیتیں گھڑنی پڑتی ہیں اور ان کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ ہر دور میں انہیں ایک نئی شخصیت کی ضرورت ہوگی۔ اس بات کی وضاحت کے لئے علامہ اقبال کا یہ مصرع بڑا پیارا ہے کہ ع

می تراشد فکرِ ماہر دم خداوندے دگر

لیکن ہمارے پاس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب، دلنواز، دلآویز، من موہنی شخصیت، معراجِ انسانیت پر فائز شخصیت..... جنؐ کی سیرت و کردار پر کوئی دشمن بھی کہیں کوئی انگلی نہ

رکھ سکا..... انسانِ کامل 'انسانی عظمت کا مظہرِ اتم شخصیت موجود ہے۔ یہ ہیں ہماری ملی تیرازہ بندی کے لئے مرکزی شخصیت۔ ان کے ساتھ دلی محبت' ان کا ادب' ان کی تعظیم' ان کا احترام' ان سے عقیدت۔ اگر اسلامی معاشرہ میں ان تمام امور کا جذبہ موجود رہے گا تو معاشرہ بنیانِ مرصوص بنا رہے گا۔ یہ وہ شخصیت ہیں کہ جن کے متعلق بالکل صحیح کہا ہے کسی شاعر نے کہ۔

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا!

یہ وہ شخصیت ہیں جن کے بارے میں علامہ اقبال نے بالکل درست کہا ہے کہ۔

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

اب اگر ہم ان دونوں کو جمع کریں کہ ایک ہے ہماری ہیئت اجتماعیہ یا حیات ملی کے لئے دستوری' آئینی اور قانونی بنیاد..... تو وہ ہے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی اطاعت۔ یہ تو گویا ایک دائرہ ہے اور اس دائرے کے درمیان ہے ایک انتہائی دلنواز اور دلآویز شخصیت بقول شاعر ع۔ "نگہ بلند سخن دل نواز جاں پر سوز"..... اس کے لئے اگر "مرکزِ ملت" کی اصطلاح اختیار کی جائے تو مجھے اعتراض نہیں۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ہمارا یہ مرکز دائم و قائم ہے۔ یہ کسی بھی دور میں بدلنے والا نہیں ہے بلکہ یہ تو ہمیشہ ہمیش کے لئے تا قیامِ قیامت جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی شخصیت ہے جو "مرکزِ ملت" کے مقام پر فائز رہے گی اور حضورؐ ہی کو معیارِ مطلق بنانا ہو گا..... مختلف مسلمان معاشروں اور مختلف مسلمان ملکوں میں یقیناً جب رہنما اور مصلح سامنے آتے ہیں تو ہمیں ان سے محبت و عقیدت پیدا ہوتی ہے۔ اگر ترکوں کے دلوں میں مصطفیٰ کمال کی عظمت ہے تو ٹھیک ہے وہ ان کے محسن تھے۔ اسی طرح پاکستانی مسلمانوں کے دلوں میں اگر قائداعظم محمد علی جناح مرحوم کی محبت ہے تو درست ہے۔ وہ ہمارے محسن ہیں۔ لیکن ہمیشہ کے لئے اور جو ابدی معیار قائم و دائم رہے گا وہ شخصیت جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ اگر ہم نے اس معیار کو مجروح کر دیا تو یہ جان لیجئے کہ پھر مسلمانوں کی حیاتِ ملی کی ایک اہم اساس منہدم ہو جاتی ہے۔ یہ ہمارا وہ معیار ہے جو مستقل ہے' دائم و قائم ہے۔ یہ نہ صرف ہماری تہذیبی و ثقافتی ہم آہنگی (HOMOGENITY) کی ضمانت دیتا ہے۔ وضع قطع اور لباس کے حدود و قیود اور

نشست و برخاست کے انداز' یہ تمام چیزیں وہ ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے اتباع سے مسلمانوں میں' چاہے وہ مشرقِ بعید کے مسلمان ہوں' چاہے مغربِ بعید کے مسلمان ہوں' چاہے دنیا کے کسی خطے میں بسنے والے مسلمان ہوں' ان سب کے درمیان ایک مناسبت' ایک ہم رنگی' ایک یکسانیت پیدا ہوتی اور وجود میں آتی ہے..... بلکہ اس تہذیبی و ثقافتی ہم رنگی' ہم آہنگی اور یکسانیت کے ساتھ تہذیب و ثقافت کا ایک تسلسل و تواتر ہے جو چودہ سو سالوں سے جاری و ساری ہے۔ یہ اسی لئے ہے کہ وہ مرکزی شخصیت ہمیشہ ہمیش کے لئے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔

ان آیات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ واقعات ایسے ہوئے کہ جن میں کچھ بے احتیاطی ہوئی' جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بلند' ارفع و اعلیٰ مقام مجروح ہونے کا کچھ اندیشہ ہوا۔ کسی نے کبھی اپنی آواز کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے کچھ بلند کر لیا..... فرمایا کہ مسلمانو! ہرگز ایسا نہ کرنا۔ یہ وہ عمل ہے کہ تمہیں محسوس بھی نہیں ہو گا لیکن یہ اتنی بڑی گستاخی شمار ہوگی کہ تمہارے پچھلے کئے کرائے سارے کام حبط ہو جائیں گے۔ تمہاری ساری نیکیاں اکارت ہو جائیں گی..... پھر مثبت انداز میں بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کی تعلیم اور اس کی افزائش کے لئے انہی کے دلوں کو جانچ کر پرکھ کر منتخب فرمالیا ہے کہ جو لوگ اپنی آوازوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز کے سامنے پست رکھتے ہیں..... پھر یہ کہ کوئی باہر سے آیا۔ جیسے کتب سیر میں واقعہ ملتا ہے کہ بنی تمیم کے کچھ لوگ آئے اور جیسا کہ عرب کا انداز اور وہاں کے بدوؤں کا ایک مزاج تھا۔ انہوں نے مسجد نبوی میں آ کر پکارنا شروع کر دیا۔ یامحمد اخرج علینا..... "اے محمد' (صلی اللہ علیہ وسلم) باہر آیئے"..... اس پر ان کو ٹوک دیا گیا لیکن ساتھ ہی فرما دیا کہ یہ لوگ ناسمجھ ہیں۔ ان کی نیت میں خلل نہیں ہے۔ پس مزاج ہے اور وہ اکھڑپن جو ان کی طبیعت ثانیہ بن گیا ہے' اسی کا یہ ظہور ہے لہٰذا ٹوکنے کے ساتھ ہی فرمایا گیا کہ: وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ "اللہ بخشنے والا ہے' رحم فرمانے والا ہے"..... لیکن احتیاط کی ضرورت ہے۔

اس کے بعد آیت نمبر ۶ میں جو بات آئی ہے' اس پر تو انشاء اللہ آئندہ نشست میں گفتگو ہوگی۔ آپ حضرات کو یاد ہو گا کہ پچھلی نشست میں میں نے اس سورۂ مبارکہ کے مضامین کو تین موضوعات میں تقسیم اور معیّن کر کے بتائے تھے۔ تو چھٹی آیت کا ان معیّن موضوعات میں سے دوسرے موضوع سے تعلق ہے۔ لیکن آیات ۷ اور ۸ میں وہ اہم ترین بات آئی ہے جو

آج کی گفتگو سے متعلق ہے۔ فرمایا: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِیْکُمْ رَسُوْلَ اللّٰہِ ط..... "خوب اچھی طرح جان لو کہ تمہارے مابین بلاشبہ جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شخصیت ہے وہ اللہ کے رسول ہیں" ..... اگرچہ یہ صحیح ہے کہ یہ محمدؐ ابن عبداللہ ابن عبدالمطلب ہیں لیکن تمہیں آپؐ کی جو شان ہر آن ملحوظ رکھنی چاہئے وہ یہ حقیقت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ اب فرض کیجئے کہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ سمجھ کر کہ حضورؐ میرے بھتیجے ہیں آپؐ کے ساتھ اس طرح کا معاملہ کریں جیسا ایک بڑا اپنے چھوٹے سے کرتا ہے تو یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسول کی حیثیت کے مجروح ہونے کا اندیشہ تھا۔ لہٰذا فرمایا گیا: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِیْکُمْ رَسُوْلَ اللّٰہِ ط۔ "اور جان لو تمہارے مابین اللہ کے رسول ہیں۔" انؐ کے ساتھ وہ معاملہ کرو جو اُمتی کو رسول کے ساتھ کرنا چاہئے۔ اور وہ ہے حضورؐ کا ادب، احترام، حضورؐ کی تعظیم و توقیر..... اس کو ہر آن ملحوظ رکھو..... اس ضمن میں صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کا یہ نقشہ خاص طور پر سامنے لایا گیا کہ اللہ نے تمہارے دلوں میں تو ایمان کو راسخ کر دیا ہے، جاگزیں کر دیا ہے، اسے تمہارے دلوں میں کھُبا دیا ہے۔ تمہارے دلوں کو ایمان سے مزیّن کر دیا ہے اور کفر سے اور فسق سے اور معصیت سے تمہیں طبعاً نفرت ہو چکی ہے۔ اس اسلوب میں جہاں صحابہ کرامؓ کی مدح ہے، وہاں یہ ترغیب و تشویق کا بھی انداز ہے کہ ذرا سی احتیاط اور ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے کہ حضورؐ کی رسول اللہ ہونے کی حیثیت کسی حال بھی نظر انداز نہ ہونے پائے۔

آخری بات یہ سامنے رکھئے کہ اس حکم پر ہم کیسے عمل کریں! اس کا تعلق ہم سے یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ثابت شدہ سنتیں اور حضورؐ کی احادیث حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم مقام ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آج بھی معناً ہمارے مابین موجود ہیں، اس لئے حضورؐ کی سنتیں آج بھی زندہ و پائندہ ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ آج بھی نصف النہار کے خورشید کی طرح درخشاں و تاباں ہے۔ ہمارے سامنے جب بھی کوئی بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آئے ہمیں اپنی عقل کو ایک طرف رکھ دینا چاہئے۔ اپنے فلسفے چھانٹنے بند کر دینے چاہئیں۔ اپنی منطق کو پس پشت ڈال دینی چاہئے۔ اپنے "اقوال" پر تالا ڈال دینا چاہئے۔ تحقیق تو ہو سکتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات فرمائی یا نہیں فرمائی لیکن ادب کا تقاضا یہ ہے کہ حضورؐ کی حدیث کے حوالے سے جب بات سامنے آئے تو زبان فوراً بند ہو جائے۔ سر فوراً جھکا دیئے جائیں۔ بعد میں اگر تحقیق سے معلوم ہو کہ روایت صحیح نہیں ہے

توٹھیک ہے اس پر اب عمل نہیں ہو گا۔ لیکن ادب کا تقاضا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بات اگر سامنے آئے تو فوراً سر تسلیم خم کر دیا جائے۔ لیکن اگر اس کے برعکس پھر بھی ہم اپنے فلسفے چھانٹیں اور اپنی منطق بگھاریں تو یہ وہ طرز عمل ہو جائے گا کہ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُکُمْ "مبادا تمہارے تمام اعمال اکارت ہو جائیں" وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ○ "اور تمہیں اس کا ادراک و احساس تک نہ ہو"۔

آج جو کچھ عرض کیا گیا ہے اگر اس کے ضمن میں کوئی سوال یا اشکال ہو تو میں حاضر ہوں.....

سوال و جواب

سوال..... نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہوتے ہوئے کسی اور کی رائے کو مقدم رکھنا کیا اتباع کے منافی نہیں ہے؟

جواب..... بہت عمدہ اور متعلق سوال ہے۔ اس کے ضمن میں جو بات جان لینی چاہئے وہ یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ثابت شدہ فرمان کے ہوتے ہوئے کسی اور کی بات کو قبول کرنا یا اُسے مقدم رکھنا یقیناً اتباع کے منافی ہے۔ بلکہ یہ تو اطاعت کے بھی منافی رویّہ ہو جائے گا۔ لیکن اس میں کلام ہو سکتا ہے کہ آیا وہ فرمان حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ نہیں ہے۔ یا یہ کہ کسی موضوع پر حضورؐ سے دو تین اقوال منقول ہیں تو ان میں کون سا قول قوی تر ہے۔ اس کے ضمن میں کوئی گفتگو اگر ہے تو اس کی بنیاد پر فیصلہ کیا جائے تو یہ طرز عمل اس فتوے کی زد میں نہیں آئے گا۔

سوال..... ڈاکٹر صاحب! مختلف قوموں نے اپنے جو ہیروز گھڑے ہیں' وہ ان کی محبت میں حد سے تجاوز کر گئے ہیں۔ اب ہماری محبت کا مرکز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو حضورؐ کی محبت کی LIMITATION کیا ہو گی! اس میں ہم کس حد تک جا سکتے ہیں!

جواب..... یہ بھی بہت ہی عمدہ اور بڑا عملی سوال ہے۔ میں اس کے ضمن میں آپ کو شیخ ابن عربی کا ایک شعر سناتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں۔

الرب رب وان تنزل والعبد عبد وان ترقی

"'رب' رب ہی رہتا ہے خواہ وہ کتنا ہی نزول اجلال فرمالے اور بندہ بندہ ہی رہتا ہے خواہ وہ کتنے ہی بلند مقام پر پہنچ جائے"۔

یہ جو فرق ہے کہ ایک مقام ہے اللہ کا اور ایک ہے مقام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ اس میں اگر فرق و تفاوت کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو اندیشہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص شرک میں ملوث ہو جائے۔ لیکن الحمد للہ میں پورے اطمینان اور انشراح کے ساتھ یہ بات عرض کر رہا ہوں کہ چودہ سو سال گزر جانے کے باوجود یہ اُمّت اللہ کے فضل و کرم سے اس طرح کی گمراہی سے بحیثیت مجموعی بچی ہوئی ہے۔ چنانچہ اگر ہم محبت و عقیدت کا معاملہ دیکھیں تو جتنی محبت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امتیوں کو آنحضورؐ سے ہے۔ شاید اس کا عشر عشیر بھی دنیا میں کسی اور جگہ نظر نہیں آئے گا۔ لیکن اس اُمّت نے احتیاط ملحوظ رکھی ہے۔ ع

باخدا دیوانہ باشد با محمدؐ ہوشیار

کہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو الوہیت کی سطح پر نہ لے جایا جائے۔ الحمد للہ کہ یہ امت بحیثیت مجموعی اس نوع کی گمراہی سے تا حال محفوظ ہے اور انشاء اللہ العزیز تا قیامِ قیامت محفوظ رہے گی۔

حضرات! آج ہم نے مسلمانوں کی حیاتِ ملّی کی شیرازہ بندی کا ایک اہم اصول سورۃ الحجرات کی چند آیات کے مطالعے کے ذریعہ سے سمجھا یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مرکزی شخصیت سے محبت و عقیدت اور آپؐ کی توقیر و تعظیم اور آپؐ کا ادب و احترام اور آپؐ کے اتباع کی اہمیت ہمارے سامنے آئی۔ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح محبت، سچی محبت اور حضورؐ کے اتباع کا جذبہ پیدا فرمادے۔ بقول علامہ اقبال مرحوم۔

ہر کہ عشقِ مصطفیٰ سامانِ اوست
بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست

بقیہ: مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی شخصیت

ناموافق ہیں اور ندوۃ المصنفین کا قائم رہنا بظاہر مشکل نظر آتا ہے۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے بہت ہی قریبی حلقے سے معلوم ہوا کہ مولانا افسوس کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ میری اولاد میں سے کسی کو یہ بھی معلوم نہیں کہ میں نے اب تک کیا لکھا ہے کیا لکھتا ہوں، میری کتابوں کے کیا کیا نام ہیں اور کون سی کتاب کس موضوع سے متعلق ہے بہر حال معاملہ کلیتہً اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ممکن ہے وہ کوئی بہتر صورت پیدا فرمادے۔ لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا۔

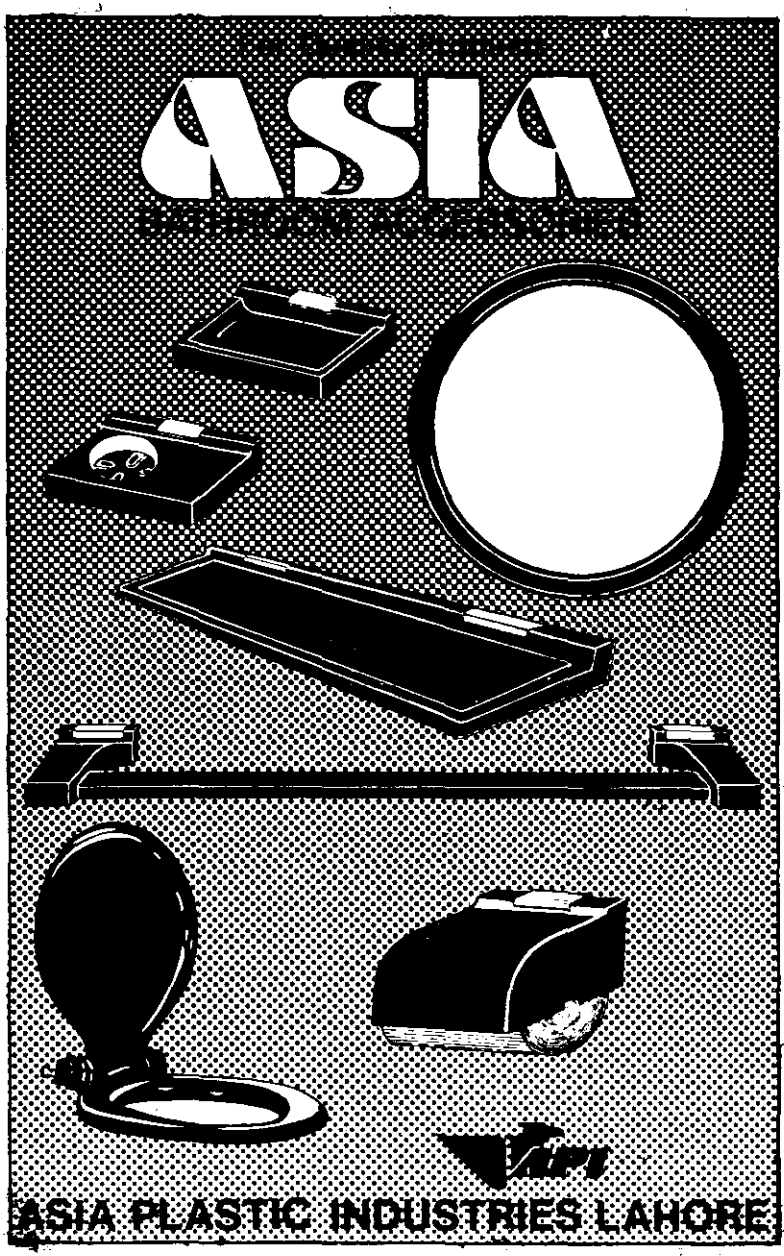
ASIA
ASIA PLASTIC INDUSTRIES LAHORE

خطابِ جمعہ

ڈاکٹر اسرار احمد

ایک پنتھ تین کاج

پاکستانی مسلمانوں کے دینی فرائض کا ایک نئے پہلو سے جائزہ

(ترتیب وتسوید: وقار احمد)

(ماہِ ستمبر میں طلبائے تنظیم اسلامی کے پہلے آل پاکستان کنونشن کے موقعہ پر امیر تنظیم اسلامی کا خطاب بعنوان "طلباء کے فرائض اور مسائل" جناح ہال لاہور میں ہوا تھا۔ اس کا تکمیلی بیان مسجد دارالسلام میں جمعہ کے خطاب میں ہوا)

سب سے پہلے تو یہ اہم بات سمجھ لینی چاہئے کہ جہاں تک دینی فرائض کا تعلق ہے اس کے اعتبار سے کسی طالب علم اور غیر طالب علم میں کچھ فرق نہیں ہے۔ دین میں اصل تقسیم جو معتبر ہے وہ ہے شعور اور بے شعوری کی تقسیم۔ جب تک کہ انسان شعور کی عمر تک نہیں پہنچتا وہ دینی فرائض کا مکلف نہیں ہے لیکن جیسے ہی وہ شعور اور بلوغ کو پہنچ جائے تو تمام دینی فرائض اس پر بیک وقت اور بیک دم عائد ہو جاتے ہیں۔ جیسے نماز اور روزہ کی فرضیت عمل میں آتی ہے اُسی طرح جملہ دینی فرائض شعور کی عمر کو پہنچنے کے بعد پوری طرح سے عائد ہو جاتے ہیں۔ فرائض دینی کے اعتبار سے ہمارے ہاں تصورات مختلف ہیں کچھ لوگ عبادات کو ہی کل دین جانتے ہیں اور کچھ اس سے وسیع اور بعض اس سے وسیع تر تصورات بھی موجود اور رائج ہیں۔ لیکن ایک اصولی بات سب کے نزدیک مسلم ہے کہ جو بھی دینی فرائض ہیں وہ ہر باشعور مسلمان پر عائد ہو جاتے ہیں' اس میں کوئی فرق اس سے واقع نہیں ہوتا کہ وہ ابھی کسی فن کی تحصیل میں یا علم حاصل کرنے میں منہمک ہے یا یہ کہ وہ عرف عام کے لحاظ سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کر چکا ہے اور ہمارے دین کے لحاظ سے تو طلبِ علم ایک ایسا مسلسل عمل ہے جو موت تک جاری رہتا ہے۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید میں تلقین فرمایا گیا "وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا" "پروردگار میرے علم میں اضافہ فرما۔" اور حضورؐ نے فرمایا "اطلبوا العلم من المهد الى اللحد"

اس حدیث مبارکہ میں مہد کا ذکر بڑا ہی اہم ہے۔ جدید نفسیاتی تصور ہے کہ بچہ پنگوڑے میں لیٹا ہوا بھی سیکھتا ہے۔ وہ اپنے حالات اور والدین سے کچھ نہ کچھ اخذ کرتا ہے۔ اپنے ماحول میں جو کچھ ہو رہا ہوتا ہے اس کا بھی بچہ تاثر (IMPRESSION) لے رہا ہوتا ہے۔ لہٰذا علم حاصل کرنا تو مہد سے لے کر لحد تک کا ایک مسلسل عمل ہے۔ اور اس طرح دینی فرائض کی ادائیگی کے اعتبار سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ کوئی ابھی تعلیم حاصل کر رہا ہے یا یہ کہ جیسے ہم عرف عام میں کہتے ہیں کہ وہ اپنی عملی زندگی کا آغاز کر چکا ہے۔

محنت و مشقت انسان کا مقدّر ہے..... اس حوالے سے دینی فرائض کا کچھ تذکرہ رات کی مجلس میں ہوا تھا۔ یہ دینی فرائض ہمارے اکثر تنظیمی اجتماعات اور خطبات جمعہ کے اہم موضوع رہے ہیں اور یہ موضوع مختلف عنوانات کے تحت اور مختلف مباحث کے ضمن میں زیر بحث آتا رہا ہے۔ آج میں سورۃ البلد کی آیت نمبر ۴ کے حوالے سے جو سورۂ مبارکہ کی مرکزی آیت بھی ہے، ہمارے دینی، ملّی اور قومی فرائض کے موضوع پر ایک نئی ترتیب سے اظہار خیال کروں گا۔ سورۃ البلد کی پہلی تین آیات وہ ہیں جن میں مختلف قسمیں کھائی گئی ہیں اور چوتھی آیت میں وہ حقیقت بیان ہوئی ہے جس کے لئے قسمیں کھائی گئی ہیں یعنی لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ "ہم نے انسان کو محنت و مشقت ہی میں پیدا کیا ہے۔" "کبد" ایسی محنت و مشقت کو کہتے ہیں جس میں کچھ عنصر ELEMENT رنج و محن کا بھی شامل ہو۔ ایک محنت تو وہ ہوتی ہے جو کرنے والے پر بار نہیں گزرتی، بلکہ بسا اوقات وہ خوشدلی سے انجام دیتا ہے لیکن ایک وہ ہوتی ہے جس میں مشقت ہی مشقت ہو اور وہ اس کو جبراً کرنا پڑتی ہو۔ لفظ مشقت کا مادہ "ش ق ق" ہے اور "شق" کہتے ہیں توڑ دینے کو، یعنی وہ انسان کی توڑ پھوڑ کا سبب بن جاتی ہے اور اس میں رنج و الم کا عنصر بھی شامل ہو تو اس کا مجموعہ بنتا ہے "کبد"۔ جیسے پہلے کئی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ اہم مضامین قرآن مجید میں کم از کم دو مرتبہ آتے ہیں اُسی اہمیت کے لحاظ سے یہ موضوع بھی قرآن مجید میں آخری پارے کی ایک اور سورۃ کا مرکزی مضمون ہے۔ سورۃ الانشقاق میں فرمایا گیا:

یٰٓاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ

"کدح" کہتے ہیں محنت و مشقت اور سعی و جہد کو۔ یعنی اے انسان تیرا مقدر یہی ہے کہ تجھے مشقت پر مشقت جھیلنی ہوگی، یہاں تک کہ تو اپنے رب کے حضور میں حاضر ہو جائے گا۔

ان دونوں آیات پر غور کرنے سے ایک تصوّر سامنے آتا ہے کہ ہر انسان کے لئے محنت

اور مشقت ہے اور اس کے لئے فرائض اور ذمہ داریوں کا ایک بوجھ ہے اور اس بوجھ سے کوئی فردِ نوعِ بشر بھی مستثنیٰ نہیں ہے۔ ایک غریب آدمی بسااوقات محسوس کرتا ہے کہ شاید امراء کے لئے کوئی مشقت اور رنج نہیں ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ سورۃ البلد کی اس آیت میں استشہاد اور قسموں کے ساتھ جو عمومی قاعدہ کلیہ بیان ہوا ہے اس کے بعد انسانوں کی کسی قسم کو مشقتوں سے بری رکھنا ناممکن ہے۔ ہاں فرق کیفیت میں پایا جاتا ہے کہ کسی کے لئے جسمانی محنت و مشقت زیادہ ہے اور کسی کے لئے ذہنی کوفت اور نفسیاتی کرب زیادہ ہے۔ چنانچہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ وہ شخص جس نے دن بھر کشتی چلائی ہو اور اینٹیں ڈھوئی ہوں وہ رات کو پرسکون نیند سوتا ہے لیکن مرغن غذائیں کھانے والے اور ائرکنڈیشنڈ کمروں میں رات گزارنے والوں میں بھی ایسے ہیں جنہیں نرم گدیلوں پر بھی نیند نہیں آتی اور انہیں مسکن اعصاب اور خواب آور گولیوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ مختصر یہ کہ نوعیت کا فرق تو ہے لیکن اس مشقت، الم اور رنج سے مستثنیٰ کوئی نہیں ہے۔ غالبؔ نے جو بڑے حساس دل اور صاحب شعور (شاعر) انسان تھے اس حقیقت کو بڑی خوبصورتی سے الفاظ کے قالب میں ڈھالا ہے:

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

بعض ذمہ داریوں کا احساس انسانی جبلّت میں ہے..... انسان کے جملہ فرائض اور ذمہ داریوں کی فہرست پر ایک نگاہ ڈالیں تو ان کی ایک تقسیم بڑی واضح نظر آتی ہے کہ ایک طرح کے فرائض وہ ہیں جن کے لئے ایک زوردار داعیہ اور تقاضا (URGE) انسان کے اندر سے ابھرتا ہے۔ ان فرائض کی بجا آوری کے لئے انسان کو نہ صرف یہ کہ کسی تلقین اور نصیحت کی ضرورت نہیں بلکہ اس کا احسان بھی کسی پر نہیں جتلا سکتا۔ مثلاً انسان کے ساتھ پیٹ لگا ہوا ہے جسے ہم معاش کے مسئلے سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس پیٹ کو بھرنے کے لئے ہر شخص از خود بھاگ دوڑ کر رہا ہے، معاشی جدّوجہد میں لگا ہوا ہے اپنے اوقات اور اپنی صلاحیتیں خرچ کر رہا ہے۔ اور اس معاملہ میں اسے کسی تلقین یا نصیحت کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کو جدید اصطلاح میں تحفظ ذات (PRESERVATION OF SPECIES) کی جبلت سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لئے انسان اپنے ہاتھ پاؤں چلانے پر مجبور ہے۔ اسی طرح ایک دوسرا بھرپور تقاضا جبلت انسانی میں جنسی جذبے کا ہے۔ یہی وہ زوردار داعیہ ہے جو انسان کو

شادی بیاہ کے جھنجھٹ میں پڑنے پر مجبور کرتا ہے اور اس کے باوجود کہ انسان کو معلوم ہے کہ شادی کے بعد ذمہ داری کا بوجھ بہت بڑھ جاتا ہے اور پہلے اگر اسے صرف اپنا پیٹ پالنا تھا تو اب وہ سارے کنبے کی کفالت کا ذمہ دار ہو گا وہ برضاو رغبت اس ذمہ داری کا بوجھ اپنے سر لیتا ہے۔ جبلت انسانی کے اس داعیے کو جدید اصطلاح میں بقائے نسل (ANIMAL INSTINCT) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ایک تیسرا تقاضا جو انسان میں از خود ابھرتا ہے اور اس کے لئے بھی کسی وعظ و نصیحت کی ضرورت نہیں ہوتی' یہ ہے کہ ہر انسان اپنا اور اپنی اولاد کا سر چھپانے کے لئے کسی جھونپڑی یا مکان کا اہتمام کرنے پر مجبور ہے۔ اس کے لئے خواہ اسے شدید محنت کرنی پڑے' یہاں تک کہ قرضہ حاصل کرنا پڑے لیکن وہ مجبور ہے کہ کوئی رین بسیرا اپنے لئے فراہم کرے..... یہ وہ تین ذمہ داریاں ہیں جن کا شدید تقاضا چونکہ انسان کے اندر سے ابھرتا ہے لہٰذا ان کے لئے کسی تلقین' وعظ یا نصیحت کی ضرورت نہیں۔ غور کرنے پر معلوم ہو گا کہ ہماری نوے فیصد بھاگ دوڑ اور محنت و مشقت کا ہدف یہی تین ذمہ داریاں ہیں۔ بلکہ ہم جس قوم کے فرد ہیں اس کی اکثریت کی صد فیصد بھاگ دوڑ صرف انہی تین ذمہ داریوں کی بجا آوری تک محدود ہے۔ ان سے زائد کسی ذمہ داری کے احساس اور شعور سے ان کی زندگی یکسر خالی نظر آتی ہے۔ انہی تین طرح کی ضرورتوں کے لئے اس دور میں "روٹی' کپڑا اور مکان" کو عنوان بنایا گیا۔ اور یہ نعرہ لگانے کی دیر تھی کہ ؎

کیا امامانِ سیاست کیا کلیسا کے شیوخ
سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک "ہو"

کے مصداق تمام قوم اس پر ٹوٹ پڑی۔ اور اس ایک "ہو" نے ہمارے ملک کی سیاست کا جو نقشہ بنایا وہ ہم سب کو خوب معلوم ہے۔ اس نعرہ میں بظاہر جنسی تقاضے کا ذکر نہیں ہے لیکن غور کرنے سے ایک عجیب حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ قرآن مجید میں ازواج کو ایک دوسرے کیلئے بمنزلہ لباس قرار دیا گیا ہے: هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ○

اور اس طرح یہ نعرہ بعینہٖ انسان کی بنیادی ضرورتوں کا حامل بن جاتا ہے۔

انسان اپنی ان تین طرح کی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں ایسے ایسے دکھ' تکلیفیں اور مشقتیں جھیلتا ہے کہ جب اس کا مشاہدہ کوئی حساس دل انسان کرتا ہے تو تڑپ جاتا ہے۔ کوئی شخص مئی اور جون کے مہینے کی شدید دھوپ میں اور زمین سے نکلتی ہوئی بھڑاس میں دن بھر کام

کر کے اپنے اور اپنے بچوں کے لئے روٹی میسر کرتا ہے۔ کوئی ماں اپنی ممتا کے تقاضے کے تحت لمبی لائن میں کھڑی ہو کر اپنے بیمار بچے کے لئے دوا حاصل کرنے میں جس اذیت سے دوچار ہے اس کا احسان وہ کسی پر جتا نہیں سکتی۔ یہ سب اذیتیں جھیلنا اللہ تعالیٰ نے انسان کے مقدر میں رکھ دیا ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ

اور انسان ان مشقتوں کا عادی ہو جاتا ہے۔ بقول غالب ؎

رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

ان ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے اعتبار سے انسان کا معاملہ کولہو کے بیل اور باربرداری کے اونٹ سے کسی طرح کم نہیں ہے بلکہ انسان کا معاملہ زیادہ سنگین ہے۔ اس لئے کہ جانوروں میں وہ احساسات نہیں پائے جاتے جن کا واسطہ انسان کو پڑتا ہے۔ کوئی بھی جانور اپنے بچے کی پیدائش کے بعد بہت ہی کم عرصے کے لئے اس سے متعلق رہتا ہے اور اس کے بعد ان کا آپس میں کوئی تعلق نہیں رہتا۔ لیکن انسانوں میں تو بچوں کا معاملہ سوہانِ روح بن کر رہ جاتا ہے۔ جس اولاد کے لئے والدین اپنی راتوں کی نیندیں حرام کرتے ہیں اور جس کے لئے اپنے آپکو ہمہ تن INVEST کر دیتے ہیں وہی اولاد ان کے لئے بڑھاپے میں سوہانِ روح بن سکتی ہے۔ اس حقیقت کو قرآن مجید میں اس طرح بیان کیا گیا ہے فَلَا تُعْجِبْکَ اَمْوَالُھُمْ وَلَآ اَوْلَادُھُمْ اِنَّمَا یُرِیْدُاللّٰہُ لِیُعَذِّبَھُمْ بِھَا فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا (پس آپ تعجب نہ کیجئے ان کے مال اور اولاد سے۔ اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ اُن کو عذاب میں رکھے۔ ان کی وجہ سے دنیا کی زندگی میں..... التوبۃ: ۵۵) پھر سب سے بڑھ کر یہ اس کے رنج و غم اسی دنیا کی زندگی تک ہی محدود نہیں ہیں، بلکہ مرنے کے بعد رب کے حضور حاضری اور مسئولیت بھی ہے! غرض انسان کا معاملہ حیوانات سے کہیں زیادہ سنگین ہے۔

بعض ذمہ داریاں جن کا تعلق انسان کے فہم و شعور سے ہے

ان تین ذمہ داریوں کے علاوہ ہر انسان کی تین ہی ذمہ داریاں ایسی ہیں جن کے لئے انسانی

جبلت میں کوئی زوردار داعیہ موجود نہیں ہے بلکہ ان کا تعلق انسان کے فہم اور شعور سے ہے۔ ان کے ضمن میں ضرورت پیش آتی ہے کہ انسان کو بار بار یاد کرایا جاتا رہے' توجہ دلائی جاتی رہے اور تذکیر کرائی جاتی رہے' مبادا انہیں بھول جائے یا ان سے غافل ہو جائے۔

ملک و وطن کی آزادی اور تحفظ کا فکر..... ان تین میں سے پہلی ذمہ داری کا تعلق انسان کے ملک و وطن سے ہے۔ اپنے وطن کی عزت' وقار' آزادی اور تحفظ کا احساس اگر وطن کے رہنے والوں کو نہیں ہو گا اور اس کے لئے اپنی توانائیوں اور اوقات کا ایک حصہ مختص نہیں کریں گے..... تو گویا وہ شاخِ آشیاں ہی ہر دم خطرے سے دوچار رہے گی' جس پر ان کا اور ان کی آل اولاد کا بسیرا ہے اور جس سے ان کا مستقبل وابستہ ہے ؎

وطن کی فکر کر ناداں قیامت آنے والی ہے
تیری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

اگر ہمارے غور و فکر اور ہماری بھاگ دوڑ کا ہدف صرف وہی تین چیزیں ہوں جن کا تعلق انسانی جبلت سے ہے تو وطن کی فکر کون کرے گا۔

قوم سے محبت اور وفاداری..... دوسری ذمہ داری ہر انسان پر اُس قوم کے حوالے سے عائد ہوتی ہے جس کا وہ فرد ہے۔ اپنی قوم کے لئے اگر اس کی صلاحیتوں اور اوقات کا ایک حصہ وقف نہیں ہے تو بات وہی ہو کر رہے جس کا نقشہ حالی نے ان الفاظ میں کھینچا ہے ؎

تن آسانیاں چاہئیں اور آبرو بھی وہ قوم آج ڈوبے گی' گر کل نہ ڈوبی

واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی دوسری اقوام کے لئے اگر کوئی دوسرا بلند نصب العین نہیں ہے تو کم از کم اپنی قوم سے محبت اور اس سے وفاداری اور ملک و قوم کے مفادات کی خاطر اپنے ذاتی مفاد قربان کرنے کا جذبہ ان میں موجود ہے اور اسی کے باعث ان اقوام کا شمار دنیا کی باعزت اور باوقار قوموں میں ہوتا ہے۔ لیکن ہمارا حال یہ ہو چکا ہے کہ نہ قوم سے محبت نہ وطن سے جذباتی لگاؤ۔ ہماری ۹۹ فیصد آبادی محض اپنے مفادات کے بارے میں سوچتی ہے اور انہی کے لئے بھاگ دوڑ کرتی ہے۔ قومی مسائل کے بارے میں سوچنے کا وقت بھی ان کے پاس نہیں ہے۔

دین کی سربلندی کے لئے جہدوکوشش..... تیسری ذمہ داری او

سب سے اہم فریضہ جس کا تعلق انسان کے فہم وشعور سے ہے' دین ومذہب کی جانب سے ہر انسان پر عائد ہوتی ہے۔ دین اپنی جگہ خواہ صد فیصد حق ہو از خود غالب نہیں ہوا کرتا۔ دین کے ماننے والے ہی اسے سربلند کرنے یا پامال کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ اگر دین پہلے سربلند تھا تو صحابہ کرام کی جان فروشیوں اور قربانیوں کی وجہ سے سربلند تھا اور آج اگر مغلوب اور سرنگوں ہے تو ہماری نا اہلی اور ہماری غفلت کی وجہ سے ہے۔ اس صدی کے آغاز میں ایک صاحبِ شعور شخص نے اس امّت کی زبوں حالی پر بڑا دردناک مرثیہ کہا تھا ؎

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے ! اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے !

اب ظاہر بات ہے کہ دین کی عظمت و سطوتِ گذشتہ کی بازیافت کے لئے پھر محنت درکار ہوگی قربانیاں دینی ہوں گی اور اپنے اوقات اور صلاحیتوں کا ایک قابل ذکر حصہ اس کام میں لگانا ہو گا۔ بصورت دیگر اگر ہم انہی تین جبلی تقاضوں کو پورا کرنے اور اپنی ذاتی اغراض کی تکمیل میں لگے رہے تو دین کی سربلندی اور غلبے کا خواب ہرگز شرمندۂ تعبیر نہ ہو گا۔

ہماری سب سے بڑی خوش قسمتی' سب سے بڑی بدقسمتی کیونکر بنی؟

..... ان تین ذمہ داریوں کو جو انسان کے ملک' اس کی قوم اور اس کے دین ومذہب کی جانب سے اس پر عائد ہوتی ہیں اور جن کا تعلق انسان کے فہم اور شعور سے ہے ذہن میں رکھ کر اس نکتے پر غور کریں کہ ہم روئے زمین کی وہ خوش قسمت ترین قوم تھے' جن کے لئے یہ تینوں تقاضے ایک وحدت کی صورت اختیار کر گئے تھے..... اور بلاشبہ یہ بہت بڑی خوش بختی کی بات ہے کہ کسی شخص کے لئے یہ موقع ہو کہ اس کے لئے کسی ایک ذمہ داری کو ادا کرنا تینوں ذمہ داریوں کی ادائیگی کا قائمقام بن جائے۔ گویا ایک تیر سے تین شکار کرنا ممکن ہو جائے.....!!

اس بات کو ہمیں ذرا تفصیل سے سمجھنا ہو گا..... سب سے پہلے اس ذمہ داری کا تعین کیجئے جو ہمارے ملک پاکستان کی جانب سے ہم پر عائد ہوتی ہے۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے' جس کا اظہار میں بار بار کر چکا ہوں اور اپنی کتاب استحکام پاکستان میں محکم دلائل سے یہ ثابت کر چکا ہوں کہ اسلام ہی ہمارے ملک کی واحد بنیاد اور اساس ہے۔ حضرت سلمان فارسیؓ کے معاملے کی مانند جو اپنی ولدیت اسلام بتایا کرتے تھے پاکستان کی ولدیت بھی صرف اور صرف۔

اسلام ہے۔ پوری دنیا میں یہ واحد ملک ہے جس کے لئے وجہ جواز سوائے اسلام کے اور کوئی نہیں..... اور اگرچہ یہ ملک پاکستان اپنی جغرافیائی حدود بھی رکھتا ہے اور اس بنیاد پر کوئی کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ وطنی قومیت اس ملک کو سہارا دے سکتی ہے' لیکن ہم اسے اس ملک کی اساس اس لئے قرار نہیں دے سکتے کہ وطنی قومیت کی پرزور تردید پر ہم نے یہ ملک حاصل کیا تھا۔

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور ساقی نے بنائی روشِ لطف و ستم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

لہٰذا وطنی قومیت کو ہرگز اس ملک کی بقا و استحکام کے لئے بنیاد قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اسی طرح تاریخی اور جغرافیائی عوامل بھی اس کی پشت پر نہیں ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس ملک کی بقا اور استحکام اگر مطلوب ہے تو اس کا واحد مؤثر ذریعہ یہ ہے کہ یہاں اسلام کی جڑوں کو مضبوط کیا جائے اور دین کو بالفعل نافذ و غالب کیا جائے۔

آگے چلئے' ہماری قومیت کا معاملہ بھی دنیا کی دیگر اقوام سے منفرد ہے۔ بقول اقبال ؎

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

ہم نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہونے کے ناطے سے ایک عالم گیر قوم کے فرد ہیں۔ یہ درست ہے کہ پاکستان ہمارا وطن ہے' لیکن ہماری قومیت صرف اور صرف اسلام ہے۔ مسلمان خواہ مشرق بعید کا ہو یا مغرب بعید کا بحیثیت مسلمان ایک ملت اور ایک قوم کا فرد ہے۔ چنانچہ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ جب ہم نے مذہبی قومیت کے نام کا نعرہ لگایا اور اس کی بنیاد پر ایک الگ خطۂ ارضی کا مطالبہ کیا تو بڑی سے بڑی قوت بھی مسلمانانِ برصغیر کے سامنے نہ ٹھہر سکی اور بالکل معجزاتی طور پر پاکستان وجود میں آ گیا۔

معلوم ہوا کہ ہماری قومیت بھی صرف اور صرف اسلام ہے اور اگر ہم دین اسلام کی سربلندی کے لئے کام کریں تو گویا ہمارے قومی تقاضے بھی از خود پورے ہوتے ہیں..... اور جہاں تک تیسری ذمہ داری کا تعلق ہے' جو دین و مذہب کی جانب سے ہم پر عائد ہوتی ہے تو سیدھی سی بات ہے کہ ہمارا دین و مذہب تو ہے ہی اسلام۔ دیکھئے! ہمارے لئے تینوں

ذمہ داریاں ایک وحدت کی صورت اختیار کر چکی ہیں۔ صرف دین کی جانب سے عائد کردہ ذمہ داریوں اور فرائض کی ادائیگی پر ملک و وطن کے فرائض سے بھی ہم عہدہ بر آ ہو سکتے ہیں اور قوم وملت کی طرف سے عائد شدہ ذمہ داریوں کی ادائیگی بھی ہمارے لئے ممکن ہو جاتی ہے..... اسلام کو مستحکم کرنے سے ملک بھی مستحکم ہوتا ہے اور ہماری قوم وملت بھی مضبوط ہوتی ہے۔ کیا اس سے بڑی خوش قسمتی کا تصور کیا جا سکتا ہے! تقابل کے لئے ذرا اپنے ان مسلمان بھائیوں کی ذہنی کشمکش کو تصور میں لائیے' جو ہندوستان میں آباد ہیں۔ ملک و وطن کے تقاضے انہیں ایک جانب کھینچتے ہیں تو دین ومذہب کے تقاضے دوسری جانب۔ خاص طور پر وہ مسلمان جو ہندوستان میں کسی عہدے یا منصب پر فائز ہوتے ہیں وہ اپنے ملک سے وفاداری کا حلف اٹھاتے ہیں۔ اس حلف اور عہد کے تقاضے اور دین ومذہب کے تقاضے بالعموم بالکل متضاد ہوتے ہیں..... لیکن انتہائی افسوس اور رنج کے ساتھ عرض کر رہا ہوں کہ ہم نے اپنی اس سب سے بڑی خوش قسمتی کو اسلام سے روگردانی کے باعث سب سے بڑی بدقسمتی میں تبدیل کر دیا۔ اسلام کے نام پر حاصل کئے گئے ملک میں چالیس سال سے زائد عرصہ گزرنے کے بعد بھی اسلام جس کسمپرسی کے عالم میں ہے وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ اس انحراف اور روگردانی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک بھی کمزور پڑتے پڑتے دولخت ہو گیا اور پاکستانی قوم بھی مضبوط ہونے کی بجائے قومیتوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی..... ابھی تک چار قومیتوں کے راگ الاپے جاتے تھے اب ایک پانچویں قومیت بھی سر اٹھا چکی ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ اسلام سے روگردانی کا منطقی نتیجہ یہی تھا' جو ہمارے سامنے آیا ہے۔ اس لئے کہ اگر اسلام اس ملک میں مضبوط ہوتا اور یہاں کے رہنے والوں کی وابستگی اسی کے ساتھ مستحکم ہوتی تو ملک بھی مضبوط ہوتا اور قوم بھی توانا ہوتی..... دیگر مسلمان ملک اگر اسلام سے انحراف کرتے ہیں تب بھی اس دنیا میں اپنی بقاء اور استحکام کے لئے ان کے لئے دوسرے سہارے موجود ہیں۔ کسی کو وطنی قومیت سہارا دے سکتی ہے تو کسی کے لئے لسانی قومیت سہارا بن سکتی ہے۔ لیکن مسلمانان پاکستان کے لئے اسلام کے سوا کوئی دوسرا سہارا موجود نہیں اور یہ وہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ہر گزرنے والا لمحہ اس کی صداقت کو مزید مستحکم کر رہا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ اگر پاکستان کی سالمیت اور اس کا استحکام مطلوب ہے تو اس کی لازمی شرط یہ ہے کہ اس ملک میں اسلام کی جڑوں کو مضبوط کیا جائے اور دین کی جانب سے جو

ذمہ داریاں ہم پر عائد ہوتی ہیں ان کی ادائیگی پر ہر شخص کمربستہ ہو جائے۔ اسی سے ملک بھی مستحکم ہو گا اور پاکستانی قوم بھی ایک مضبوط قوم بن کر اقوام عالم میں ابھرے گی۔

ہمارے دینی فرائض اور ان کے مدارج

اب ہمیں یہ جائزہ لینا ہے کہ دین کی جانب سے ہم پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ تین کے ہندسے کے حوالے سے ذہن نشین کر لیجئے کہ ہماری دینی ذمہ داریاں بھی تین ہی ہیں:

(۱) عبادت رب..... یعنی خود اللہ کا بندہ بننا' اللہ کا مطیع بننا اور خود اسلام پر پوری طرح عمل پیرا ہونا۔ یہ پہلی ذمہ داری بھی کچھ آسان نہیں ہے۔ اس کے بارے میں اقبالؔ نے کہا ہے ؎

چو می گویم مسلمانم بہ لرزم کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

اس مرحلے پر تین جہاد کرنے پڑتے ہیں۔

۱۔ نفسِ امّارہ سے جہاد..... ہمارے اندر موجود حیوانی داعیات (ANIMAL INSTINCTS) اندھے بہرے ہیں اور اپنی تسکین چاہتے ہیں۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ حلال کیا ہے اور حرام کیا ہے۔ شدید بھوک لگی ہوئی ہو تو پیٹ یہ چاہتا ہے کہ اسے بھرا جائے' خواہ حلال سے' خواہ حرام سے۔ اسی طرح جب جنسی تقاضا ابھرتا ہے تو وہ اپنی تسکین چاہتا ہے' اسے اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ یہ جائز ذریعے سے ہو یا ناجائز ذریعے سے۔ لہٰذا سب سے پہلے اپنے اندر سے کشمکش کرنی ہو گی اور نفس کو اپنے تابع کرنا ہو گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ المجاھد من جاھد نفسہ۔ "مجاہد تو ہے ہی وہ جو اپنے نفس سے جہاد کرے"۔ ایک حدیث کے الفاظ ہیں۔ لیس الشدید بالصّرعۃ انما الشدید الذی یملک نفسہ عند الغضب۔ "کسی کو کشتی میں پچھاڑ دینے والا پہلوان نہیں ہے' پہلوان تو دراصل وہ ہے جو غصے کی حالت میں اپنے نفس پر قابو رکھے"۔ حضورؐ سے پوچھا گیا۔ ای الجھاد افضل یا رسول اللہ؟ "اے اللہ کے رسولؐ! سب سے افضل جہاد کونسا ہے؟" فرمایا۔ ان تجاھد نفسک فی طاعۃ اللہ۔ "یہ کہ تم اپنے نفس سے جہاد کر کے اُسے اللہ کا مطیع بناؤ!"۔

۲۔ شیطان لعین سے جہاد..... شیطانِ لعین نفسِ انسانی میں پھونکیں مارتا رہتا

ہے اور اس کے حیوانی داعیات کو مشتعل کرتا رہتا ہے' لہٰذا نفس سے جہاد کے ساتھ ساتھ شیطان لعین سے جہاد بھی ضروری ہے۔

۳۔ بگڑے ہوئے معاشرے سے جہاد..... نفس اور شیطان سے جہاد کے علاوہ اپنے بگڑے ہوئے ماحول اور معاشرے کے ساتھ بھی کشمکش کرنا ہو گی' اس لئے کہ معاشرے کا رخ اور ہے' اس کی اقدار (VALUES) اور ہیں' اس کی پسند اور ناپسند کے معیارات اور ہیں۔ چنانچہ جب تک اس کے ساتھ کشمکش نہ ہو گی آپ خود مسلمان نہیں بن سکتے۔ آپ کو ؎ "زمانہ باتو نہ سازد تو با زمانہ ستیز!" کی روش اختیار کرنا ہو گی۔ اگرچہ سہولت اور عافیت کا راستہ ؎ "زمانہ باتو نہ سازد تو با زمانہ بساز!" والا ہے' لیکن صاحبِ ہمت اور صاحبِ عزیمت لوگ پہلا راستہ اختیار کرتے ہیں اور زمانہ ان کی موافقت نہ کرے تو وہ خود زمانے کے ریلے کے ساتھ بہنے کی بجائے مزاحمت کرتے ہیں اور اس سے جنگ کرتے ہیں۔

۲۔ دعوت و تبلیغ..... ہماری دوسری دینی ذمہ داری یہ ہے کہ دین کی تبلیغ اور اشاعت میں بھرپور حصہ لیں اور اسے دوسروں تک اس طرح پہنچائیں کہ ابلاغ کا حق ادا ہو جائے اور حجت قائم ہو جائے۔ اس کی بھی تین سطحیں ہیں اور یہاں بھی ہر سطح پر مجاہدہ کرنا ہو گا۔

۱۔ معاشرے کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ اور ذہین اقلیت (INTELLECTUAL MINORITY) تک دین کا پیغام پہنچانا۔ ان کے لئے تبلیغ کا انداز کچھ اور ہو گا۔ یہاں جذباتی اپیل کی بجائے عقلی دلیل سے کام لینا ہو گا۔ انہیں وعظ و نصیحت کی بجائے حکمت سے قائل کرنا ہو گا' لیکن اس کے لئے پہلے دنیا کے فلسفوں اور ان کی حکمت کو سمجھنا ہو گا اور پھر قرآن اور حکمت قرآنی کو سمجھ کر دلائل و براہین کے ساتھ ان فلسفوں کا ابطال کرنا ہو گا۔ کبھی ایک زمانے میں احمد ندیم قاسمی صاحب نے ایک شعر کہا تھا ؎

یہ زمیں' یہ فضا کی رقاصہ آدمِ نو کے انتظار میں ہے

اس پر نعیم صدیقی صاحب نے ایک بڑا عمدہ شعر کہا تھا ؎

بانجھ ہیں فلسفے زمانے کے آدمِ نو کو یہ نہ پال سکے!

تو آج دنیا میں یہ جو فلسفے ہیں یہ "آدمِ نو" کو تو وجود میں نہیں لا سکتے۔ اُس "آدمِ نو" کو وجود میں لانے کے لئے قرآن کی حکمت درکار ہے۔ اور اس حکمت کو دنیا کے سامنے پیش کرنے

کے لئے پہلے خود اس سے سیراب ہونے اور اپنے قلوب و اذہان کو اس سے منور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے اپنے وقت ' اپنی صلاحیتوں ' اپنی قوتوں اور اپنی امنگوں کی قربانی دینی ہوگی۔ کچھ باصلاحیت ذہین نوجوان اپنے اعلیٰ ترین کیریئرز کو قربان کر کے اس میں لگ جائیں اور گھٹنے ٹیک دیں کہ " جاایں جااست " تب ہی یہ کام ہو سکتا ہے ' از خود تو نہیں ہو سکتا۔

۲۔ دعوت و تبلیغ کی دوسری سطح عوامی سطح پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دینا ہے۔ یعنی معاشرے کے عام افراد کو ایک اصلاحی انداز میں مواعظِ حسنہ کے ذریعے بھلائی کی طرف بلانا اور انہیں برائیوں سے باز رہنے کی تلقین کرنا۔

۳۔ دین کی دعوت و اشاعت کی تیسری سطح ایسے گمراہ فرقوں اور باطل مذاہب کے نظریات و افکار کا رد ّ ہے جو اسلام کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ آپ خلاء میں کام نہیں کر رہے بلکہ آپ کی دعوت و تبلیغ دین کے مقابلے میں کئی قسم کی قوتیں برسرپیکار ہوں گی اور آپ کا راستہ روکنے کی کوشش کریں گی۔ یہاں جدید نظریاتی قوتیں بھی ہیں اور قدیم مذہبی انداز کے فتنے بھی ' جو اسلام کے پورے نظامِ فکر کو اندر سے کھوکھلا کرنے کے درپے ہیں۔ ان قوتوں کا مقابلہ علمی میدان میں کرنا ہو گا اور ان کو مناظروں اور مجادلوں سے شکست دینا ہوگی۔

دعوت و تبلیغ کوئی سادہ اور بسیط شے نہیں ہے بلکہ اس کی مختلف سطحیں اور مختلف درجات ہیں۔ مذکورہ بالا تین سطحیں قرآن حکیم کی اس آیۂ مبارکہ میں بیان ہوئی ہیں۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (النحل : ۱۲۵)

"اے نبیؐ ! آپؐ اپنے رب کے راستے کی طرف بلایئے حکمت و دانائی کے ساتھ اور اچھی نصیحتوں کے ذریعے اور اُن کے ساتھ ایسے طریقے پر بحث کیجئے جو سب سے بہتر ہو"۔

۳۔ اقامتِ دین..... دین کی جانب سے ہم پر تیسری ذمہ داری یہ عائد ہوتی ہے کہ دین کے عطا کردہ نظامِ عدلِ اجتماعی کو بالفعل قائم کریں۔ یہ ہمارے دینی فرائض کی بلند ترین منزل ہے۔ "اقامتِ دین" اور "اظہارِ دین" کی قرآنی اصطلاحات اسی ذمے داری کے ضمن میں وارد ہوئی ہیں۔ اس سطح پر اُن استحصالی قوتوں کے خلاف جدوجہد اور پنجہ آزمائی

کرنا ہوگی، جو لوگوں کو ظلم و استحصال کا نشانہ بنا کر اُن کے حقوق کو غصب کرتی ہیں اور دنیا میں قائم نظام ہائے باطل کا تحفظ کرتی ہیں۔ اُن باطل نظاموں کی بیخ کنی کر کے اُس نظامِ برحق کو قائم و نافذ کرنے کی جہد و کوشش کرنا جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں دینِ حق کی صورت میں عطا فرمایا ہے، ہمارے دینی فرائض کا جزوِ لازم ہے۔ اس عادلانہ نظام کے عطا کرنے والے کی اپنی شان بھی "قَائِمًا بِالْقِسْطِ" ہے اور اس نے ہمیں بھی بایں طور پکارا ہے۔
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ (النساء) اور
كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ (المائدۃ)
اسی نظامِ عدل و قسط کے قیام کے لئے ہی اللہ نے اپنے رسولوں کو بھیجا اور کتابیں نازل فرمائیں۔ سورۃ الحدید میں رسولوں کی بعثت اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتارنے کا مقصد ہی یہ بیان فرمایا گیا کہ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔
چنانچہ ہمیں اس نظامِ عدل اجتماعی کے نفاذ اور اُس دینِ حق کے غلبے کے لئے تن من دھن لگانا ہو گا۔

اس مرحلے پر تصادم کی صورت محض نظریاتی نہیں، بلکہ عملی ہو گی۔ یہاں طاقت طاقت سے ٹکرائے گی۔ اور اس ٹکراؤ کے لئے پہلے طاقت فراہم کرنی ہو گی: وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ..... اور اس سلسلے میں ہتھیاروں کی طاقت سے بھی زیادہ ضروری انسانوں کی طاقت ہے۔ ؏ انسانم آرزوست!
یہاں ایسی افرادی قوت کی ضرورت ہے جس میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ گہری وابستگی اور وفاداری موجود ہو۔ یہ لوگ اپنے وجود سے حق کے حق ہونے کی گواہی دیں۔ ؏ دے تو بھی محمدؐ کی صداقت کی گواہی!
اس ضمن میں اقبالؔ کے دو اشعار کے بغیر یہ بحث تشنہ رہے گی ۔

مقامِ بندگی دیگر، مقامِ عاشقی دیگر
ز نوری سجدہ میخواہی، ز خاکی بیش ازاں خواہی
چناں خود را نگہ داری کہ با ایں بے نیازی ہا
شہادت بر وجودِ خود ز خونِ دوستاں خواہی

اللہ چاہتا ہے کہ اس جریدۂ عالم پر اہلِ ایمان اپنے خون سے اس کی توحید کی شہادت ثبت کریں، اور اس کے نظامِ عدل کی گواہی قولاً و عملاً قائم کریں۔ اس مرحلے کی بھی تین سطحیں ہیں۔

۱۔ صبرِ محض (PASSIVE RESISTANCE) جب تک اسلام سے گہری وابستگی رکھنے والے افراد کی ایسی منظم جمعیت فراہم نہیں ہو جاتی کہ نظامِ باطل سے کھلم کھلا تصادم مول لیا جا سکے اس وقت تک "صبرِ محض" کے اصول پر عمل پیرا رہنا ہو گا۔ گویا اس دوران تصادم یکطرفہ ہو گا۔ نظامِ باطل کے پاسبانوں کی طرف سے بھرپور تشدد کیا جائے گا' ہر طرح کی سختی کی جائے گی' لیکن جواب میں ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہ ہو گی' بلکہ ہر طرح کی سختی کا جواب صبرو استقامت سے دیا جائے گا۔ مکی دور میں یہی "صبرِ محض" کا اصول پیشِ نظر تھا کہ حضرت بلالؓ کو مکہ کی گلیوں میں گھسیٹا جا رہا تھا اور حضرت خبابؓ بن الارت کو دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹایا جا رہا تھا لیکن ان کو جھیلنے اور برداشت کرنے کی ہدایت تھی اور کسی جوابی اقدام کی اجازت نہ تھی۔ حضرت یاسرؓ اور حضرت سمیہؓ "اصبروا یاال یاسر فان موعد کم الجنۃ" کی ہدایت پر کاربند رہتے ہوئے سختیاں جھیلتے جھیلتے جامِ شہادت نوش کر گئے' لیکن مسلمانوں کو ان کے خونؓ کا انتقام لینے کی اجازت نہ تھی۔

۲۔ اقدام (ACTIVE RESISTANCE) .... اقامتِ دین کی جدوجہد "صبرِ محض" کے کٹھن مرحلے سے گزر کر آخر کار "اقدام" کے مرحلے میں داخل ہو گی۔ جب اتنی قوت فراہم ہو جائے کہ باطل نظام کو چیلنج کرنا ممکن ہو تو اس نظام کی کسی دکھتی رگ کو چھیڑ کر اسے للکارا جائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی جدوجہد "اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا" کے فرمانِ الٰہی کے ساتھ "اقدام" کے مرحلے میں داخل ہو گئی تھی۔ موجودہ دور میں "اقدام" کا انداز یہ ہو گا کہ منکرات کو چیلنج کیا جائے گا۔ جو کام شریعت اسلامی میں حرام ہیں اُن کے بارے میں دوٹوک اعلان کیا جائے گا کہ یہ ہمارے جیتے جی نہیں ہو سکیں گے۔ منکرات و فواحش کو رکوانے کے لئے مظاہروں' گھیراؤ اور پکٹنگ (PICKETING) کا راستہ اختیار کیا جائے گا۔ یہ کام وہی لوگ کر سکیں گے جو راہِ حق میں جان قربان کر دینے کے آرزومند ہوں۔ نظامِ باطل کو للکارنے سے جس تشدد کا سامنا کرنا پڑے گا اس کے مقابلے میں ثابت قدمی کا مظاہرہ کرنا ہو گا۔ لاٹھی اور گولی کے باوجود قدم آگے بڑھانے ہوں گے' پیچھے نہیں ہٹنا ہو گا۔ سینوں پر گولیاں کھانی ہوں گی' گلیوں میں بھاگتے ہوئے پیٹھوں پر نہیں۔ توڑ پھوڑ اور ہنگامہ آرائی سے بالکلیہ اجتناب برتنا ہو گا۔ سٹریٹ لائٹس اور نیون سائنز کو توڑنا اور بسوں اور عمارتوں کو نذرِ آتش کرنا اسلام کا راستہ ہرگز نہیں۔ اس جدوجہد کی مثال ایرانی انقلاب کی شکل میں ہمارے سامنے ہے کہ لوگوں نے

استقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے قربانیاں دیں' سینوں پر گولیاں کھائیں' جان کے نذرانے پیش کئے' ساوک کے بھیڑیوں نے ان کی ہڈیاں توڑ ڈالیں لیکن انہوں نے توڑ پھوڑ کا راستہ اختیار نہیں کیا۔ گولیوں کی بوچھاڑیں بھی ان کے پائے استقلال کو متزلزل نہیں کر سکیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اڑھائی ہزار سالہ عظمت کی بازیافت کا خواب دیکھنے والے شہنشاہ آریہ مہر کو اپنا تخت و تاج چھوڑ کر بھاگتے بنی اور ؎

دو گز زمیں بھی مل نہ سکی کوئے یار میں!

لیکن اس مرحلے کے لئے معیار مطلوب کی حامل منظم جمعیت اور اس راہ میں جان نچھاور کرنے کی شدید تمنا از بس ضروری ہے۔ یہ وہ آرزو ہے کہ جس کا اظہار خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں فرمایا:

لو ددت ان اقتل فی سبیل اللہ ثم احیا ثم اقتل ثم احیا..... "میری شدید آرزو ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں' پھر میں زندہ کیا جاؤں' پھر قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جاؤں....." حضورؐ نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص اس حال میں مر جائے کہ نہ اس نے کبھی اللہ کی راہ میں جہاد کیا ہو اور نہ ہی اس کے دل میں اس کی تمنا پیدا ہوئی ہو تو اس کی موت ایک نوع کے نفاق پر ہوئی۔ چنانچہ اگر دین کے لئے ایثار و قربانی کا شدید داعیہ موجود نہ ہو اور اس راہ میں جان نچھاور کرنے کی شدید تمنا دل میں نہ ہو تو یہ منزل سر نہیں کی جا سکتی۔

۳۔ مسلح تصادم (ARMED CONFLICT)..... اقدام کے مرحلے کے بعد اقامتِ دین کی جدوجہد کو "مسلح تصادم" کا مرحلہ پیش آ سکتا ہے۔ یعنی اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے اور قوت و طاقت کے استعمال سے باطل کی بیخ کنی کی جائے۔ آنحضورؐ کی انقلابی جدوجہد میں ہمیں یہ مرحلہ بدر و حنین وغیرہ کے معرکوں کی صورت میں نظر آتا ہے۔ بحالات موجودہ تو یہ مرحلہ یکسر خارج از بحث نظر آتا ہے' تاہم اس کے امکان کو بالکلیہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

بہرحال ہر صاحب شعور مسلمان پر دین کی طرف سے یہ تین ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جن میں سے ہر ایک پھر تین میں منقسم ہو جاتی ہے۔ اس ضمن میں طالب علم اور غیر طالب علم کے مابین کوئی فرق و تفاوت نہیں۔ طالب علم ہونے کی حیثیت سے ہمارے کوئی الگ مسائل نہیں ہیں۔ جو مسئلہ اس قوم کا ہے وہی طالب علموں کا مسئلہ ہے۔ یہ کمیونسٹ طریق کار ہے کہ

(باقی ص۴۵ پر)

تازہ، خالص اور توانائی سے بھرپور

پاک پیئور®

مکھن اور دیسی گھی

یونائیٹڈ ڈیری فارمز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

(قائم شدہ ۱۸۸۰) لاہور

۲۲- لیاقت علی پارک ۴- بیڈن روڈ- لاہور، پاکستان۔

فون: ۲۲۱۵۹۸-۳۱۲۷۵۴

SV ADVERTISING

(قسط: ۲)

حقیقتِ جہاد

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک اہم خطاب

ترتیب وتسوید: حافظ خالد محمود خضر

اب آیئے اس بحث کی طرف کہ جہاد کے مراحل اور مراتب کیا ہیں؟ اس کا نقطۂ آغاز کیا ہے؟ اس کی پہلی منزل کون سی ہے؟ دوسری منزل کیا ہے؟ کوئی تیسری منزل بھی ہے تو کون سی ہے؟ اور اس کی چوٹی کیا ہے؟ اگر یہ سارا تصور واضح نہ ہو تو انسان غلط جگہ پر اور غلط طریقے پر اپنی محنت صرف کرے گا اور وہ محنت اکارت جائے گی۔ آپ اس راستے میں جان اور مال تو کھپا رہے ہیں لیکن اس جدوجہد کی ترتیب آپ کے ذہن میں نہیں ہے' اس کے مراحل میں جو تقدیم اور تاخیر ملحوظ رکھنی ضروری ہے اس کا فہم نہیں ہے' چھلانگ مار کر چوتھی منزل پر چڑھنے کی کوشش ہو رہی ہے' قدم بقدم آگے چلنے کا شعور نہیں ہے تو محنتیں اکارت جائیں گی' کوششیں بار آور نہیں ہوں گی۔ البتہ ایک فرق ذہن میں رکھئے کہ یہ وہ میدان ہے کہ اس میں اگر کوئی شخص کسی مغالطے یا غلط فہمی کی بنا پر غلط طریقے پر کام کر رہا ہے' لیکن وہ اپنی جدوجہد میں مخلص ہے اور خالصۃً اللہ اور اس کے دین کے لئے کام کر رہا ہے تو اگرچہ دنیا میں اس کی محنت و کوشش نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوگی اور رائیگاں اور اکارت جائے گی لیکن آخرت میں اس کا اجر اس کے رب کے پاس محفوظ ہے۔

مجاہدہ مع النفس

جہاد کے مراتب کو سمجھنے کے لئے ایک تین منزلہ عمارت کی تشبیہ ذہن میں رکھئے' جس کی بنیاد زیرِ زمین ہے اور دکھائی نہیں دیتی۔ نگاہوں کے سامنے تو تین منزلیں ہیں۔ پہلی' دوسری اور تیسری۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس عمارت کے استحکام کا سارا دارومدار اس بنیاد پر ہے جس پر یہ منزلیں کھڑی ہیں۔ اگر یہ بے بنیاد ہی کھڑی کر دی گئی ہیں تو سیلاب کا معمولی سا ریلا بھی اسے زمین بوس کر دے گا۔ اسی طرح اگر بنیاد ٹیڑھی یا کمزور ہے تب بھی یہ عمارت مضمحل

رہے گی اور اس کے لئے استحکام نہیں ہو گا۔ تو جہاد کے مراتب میں پہلی چیز جس کو بنیاد (FOUNDATION) کی حیثیت حاصل ہے وہ مجاہدہ مع النفس ہے۔ اور اس کے باقی تین مراتب کی حیثیت تین منزلوں کی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان میں اہم ترین چیز بنیاد ہے لیکن آج کے دور میں یہی سب سے زیادہ نظر انداز ہونے والی چیز ہے۔ اپنے نفس سے کشمکش کر کے اسے اللہ کا مطیع بنانا جہاد کی بنیاد ہے۔ اور جس طرح عمارت کی بنیاد زمین کے اندر ہوتی ہے اور نظر نہیں آتی اسی طرح جہاد کا یہ مرحلہ 'جسے میں بنیاد سے تعبیر کر رہا ہوں' نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے۔ یہ مجاہدہ اکثر و بیشتر تو تنہائی میں ہوتا ہے۔ یہ باطنی جنگ مجاہدہ مع النفس ہے۔

انسان کا نفس بڑا خود سر ہے اور فرعون کی طرح خدائی کا مدعی اور اللہ کا مدِ مقابل بنتا ہے۔

نفسِ ما ہم کمتر از فرعون نیست
لیک اورا عون' ایں را اعون نیست

میرا نفس بھی فرعون سے ہرگز کم نہیں ہے' لیکن اس کا لاؤ لشکر تھا' میں فقیر آدمی ہوں۔ میرے پاس فوج نہیں ہے۔ وہ زبان سے بھی کہہ گیا اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی میں زبان سے تو یہ نہیں کہہ سکتا لیکن میرا نفس یہی دعویٰ کرتا ہے۔ نفس کا کوئی تقاضا ابھرتا ہے تو وہ یہ تقاضا پورا کروانا چاہتا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ کیا حلال ہے اور کیا حرام ہے! جدید سائیکالوجی آپ کو بتائے گی کہ نفس کی گہرائیوں میں جب کوئی خواہش جنم لیتی ہے' کوئی تقاضا ابھرتا ہے تو شخصیت کے اندر ایک شدید کھچاؤ (TENSION) پیدا ہو جاتا ہے اور اس کھچاؤ کو دور کرنے کی صورت یہی ہے کہ وہ خواہش پوری کی جائے۔ فرائیڈ نے اسی پر اپنے فلسفے کی منزلیں تعمیر کر لی ہیں کہ اگر کسی خارجی دباؤ کی وجہ سے آپ وہ خواہش پوری نہیں کر سکتے تو وہ آپ کے اندر آپ کی نفسیات کی گہرائیوں میں جا کر ڈیرے جمالیتی ہے اور پھر وہاں سے آپ پر حملہ کرتی ہے۔ کبھی وہ خواہش آپ کو خوابوں میں نظر آئے گی' کبھی وہ تحت الشعور سے یکدم آپ پر حملہ کرے گی اور آپ کو چاروں شانے چت گرا دے گی۔ ہو سکتا ہے کہ آپ بڑی نیک نیتی سے وعظ کہہ رہے ہوں اور عین اس وقت نفس کے تہہ خانوں سے وہ خواہش آپ پر حملہ آور ہو اور آپ کی نیت کے اندر خلل پیدا کر دے۔ تو یہ اس کا فلسفہ ہے۔

بہرحال اس کو چھوڑیئے' لیکن یہ تو ہمارا اپنا تجربہ ہے کہ جب کوئی خواہش ابھرتی ہے تو یہ اپنی تسکین چاہتی ہے۔ اسے اس سے غرض نہیں ہے کہ حلال کیا ہے اور حرام کیا ہے' صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے' جائز کیا ہے اور ناجائز کیا ہے! اللہ نے کون سا راستہ اس کی تسکین کا حلال

قرار دیا ہے اور کون سے راستے کو حرام قرار دیا ہے! تو یہاں ایک کشمکش کی ضرورت ہے۔ نفس ایک منہ زور گھوڑا ہے' جس کو لگام دینے کی ضرورت ہے۔ یہ مجاہدہ اور یہ کشمکش جہاد کی اصل بنیاد ہے۔ حضورؐ سے پوچھا گیا۔ ایّ الجهاد افضل یا رسول اللّٰه؟ اے اللہ کے رسولؐ سب سے افضل جہاد کون سا ہے؟" دیکھئے اصل جو افضلیت ہے وہ بنیاد کی ہے اگرچہ وہ نظر نہیں آرہی ہے۔ چنانچہ آپؐ نے جواب دیا۔ ان تجاهد نفسک فی طاعة اللّٰه "سب سے افضل جہاد یہ ہے کہ تم اپنے نفس کے ساتھ کشمکش کرو اور اسے اللہ کی اطاعت اور بندگی کا خوگر بناؤ"۔ یہ ہے اصل جہاد' یہ ہے اس عمارت کی بنیاد۔ اگر یہی نہیں ہے اور جہاد کی دوسری منزلیں تعمیر کرنی شروع کر دی گئیں تو وہ تعمیر بودی رہے گی اور کسی طوفان کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ کوئی معمولی سا ریلا بھی آئے گا تو اسے بہا کر لے جائے گا۔ اور جان لیجئے کہ اس دور میں ہمارے ہاں اس سلسلے میں جو محنتیں ہوئیں اور عوامی سطح پر ہم نے بڑے بڑے مورچے لگا کر جو تحریکیں چلائیں ان کی ناکامی کا اصل سبب یہی ہے کہ جہاد کی اس بنیاد کی طرف وہ توجہ نہیں ہوئی جو ہونی چاہئے۔

اللہ کا ہم سے پہلا تقاضا ہی یہ ہے کہ ہم اس کے بندے بنیں۔ ہمیں اس نے پیدا ہی اس لئے کیا ہے کہ ہم اس کی عبادت کریں۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ○ تمام رسول یہی دعوت لے کر آئے۔ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَالَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۔ خود قرآن اسی دعوت کو لے کر نازل ہوا۔ الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ○ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ اسی کا عہد ہم اپنی نماز کی ہر رکعت میں کرتے ہیں: اِيَّاكَ نَعْبُدُ...... اب عبادت کے معنی کیا ہیں؟ اللہ کی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر اس کی کلی اطاعت! حقیقت یہ ہے کہ یہ بڑا کٹھن راستہ ہے۔ اس میں باہر سے رکاوٹیں تو بعد میں آئیں گی' سب سے پہلی رکاوٹ تو اندر سے آتی ہے۔ اس راہ کا سب سے پہلا دشمن انسان کے اپنے اندر ہے یعنی نفسِ امّارہ۔ لہٰذا اس کے ساتھ کشمکش کئے بغیر چارہ نہیں ہے۔

اب یہاں یہ بات ذہن میں رکھئے کہ نفس کے ساتھ اس کشمکش اور مجاہدہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہمیں کچھ ہتھیار عطا کر دیئے ہیں' جن کے ساتھ ہمیں نفس کے حملوں کا مقابلہ کرنا ہو گا۔ ہم پر اس نفس کا سب سے پہلا وار نسیان اور ذہول کی شکل میں ہوتا ہے۔ یہ ہمیں اپنے اندر اس طرح گم کر لیتا ہے کہ ہمیں یہ یاد ہی نہ رہے کہ ہم اللہ کے بندے ہیں۔ اس کے لئے

ہمیں اللہ نے جو ہتھیار دیا وہ "نماز" ہے۔ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ نفس کے اس حملے کا مقابلہ تم نماز کے ذریعے سے کرو۔ یہ نماز تمہیں یاد دلاتی رہے گی کہ تم نے اپنے رب سے ایک عہد استوار کر رکھا ہے۔ حفیظ کا ایک بڑا پیارا شعر ہے۔

سرتی نے کر دیئے دھندلے نقوشِ بندگی
آؤ سجدے میں گریں لوحِ جبیں تازہ کریں!

نفس کا دوسرا بڑا ہتھیار مال کی محبت ہے' جس کے ذریعے وہ ہم سے سرکشی کراتا ہے۔ نفس کا تقاضا ہے کہ مال آنا چاہئے' چاہے حلال ذریعے سے ہو یا حرام ذریعے سے' جائز ہو یا ناجائز۔ اس کے اس وار کو زکوٰۃ و صدقات کے ہتھیار سے روکو اور اس کی تلوار کو کند کر دو۔ اللہ کی راہ میں خوب انفاق کرو تاکہ نفس کا یہ وار بھی کاری نہ رہے۔ نفس کا ایک اور وار ہم پر ہوتا ہے خواہشات نفس کی صورت میں جن میں اہم ترین بھوک اور شہوت ہیں۔ بھوک زندگی کے تسلسل اور بقائے ذات (PRESERVATION OF SELF) کے لئے ضروری ہے اور شہوت بقائے نسل (PRESERVATION OF SPECIES) کے لئے' لیکن نفس ان دونوں داعیات کو بھڑکاتا ہے اور اس راستے سے زور لگا کر ہمیں بندگیٔ رب سے منحرف کرتا ہے۔ نفس کے اس وار سے بچاؤ کے لئے ہمیں جو ہتھیار دیا گیا وہ "روزہ" ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: اَلصَّوۡمُ جُنَّۃٌ..... یہ روزہ ڈھال ہے' نفس کے ان حملوں کو تم اس پر روک سکو گے۔

نفس کے حملوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمیں ایک اور جامع ہتھیار "حج" کا دیا گیا ہے۔ اس میں پیسہ بھی خرچ ہوتا ہے تو زکوٰۃ و صدقات سے مناسبت ہو گئی۔ اس میں مشقت بڑی جھیلنی پڑتی ہے' جسمانی عبادت بھی ہے' طواف بھی ہے اور وہاں کی بہت سی مشقتیں ہیں' لہٰذا نماز سے بھی مناسبت ہو گئی۔ اور احرام کے دوران شہوت وغیرہ پر پابندیاں بھی لگتی ہیں تو اس طرح اس کی صوم سے مشابہت ہو گئی۔ چنانچہ مجاہدہ مع النفس کے لئے جامع ترین ہتھیار جو ہے وہ حج ہے۔

اب آپ ٹھیک طور سے سمجھ گئے ہوں گے کہ فلسفۂ دین میں نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ کی کیا حیثیت ہے۔ یہ درحقیقت مجاہدہ مع النفس کے ہتھیار ہیں۔ یہ انسان کی غرضِ تخلیق عبادت کے تقاضے پورا کرنے کی خاطر اس کو تقویت دینے کے لئے عبادات ہیں' جو فرض کر دی گئی ہیں

تاکہ وہ اللہ کا بندہ بن سکے جیسا کہ اس کا بندہ بننے کا حق ہے۔ لو یہ عبادات ہم پر بوجھ نہیں بلکہ اللہ کے انعامات ہیں۔ اس کی طرف سے ہمارے لئے عطیات اور تحائف ہیں۔ یہ ہتھیار ہیں جو اللہ نے ہمارے ہاتھ میں تھما دیئے ہیں تاکہ ہم نفس کے حملوں کو روک سکیں۔ ان سب کے علاوہ مجاہدہ مع النفس کے لئے ایک ہتھیار اور بھی ہے' اور وہ ہے بالفاظ قرآنی : کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ..... یعنی ایسے لوگوں کی معیت اور مصاحبت اختیار کرو' ایسے لوگوں کی صحبت سے فیض حاصل کرو جو یا تو نفس کی کشمکش سے گزر چکے ہوں اور نفس کو زیر کر چکے ہوں یا بر سبیل تنزل وہ بھی اسی کشمکش میں لگے ہوئے ہوں تو وہ تمہارے لئے ذہنی سہارا بنیں۔ ؎

نہ من تنہا دراں مے خانہ مست ام
جنید و بایزید ہم مست ایں جا

میں ہی نہیں ہوں تنہا میرے دائیں بائیں اور بھی ہیں جو اسی کشمکش میں اسی مجاہدہ مع النفس میں شریک ہیں۔

اسی کشمکش میں نفس کے پاس ایک ہتھیار اور بھی ہے' جس سے وہ ان تمام ہتھیاروں کو کند کر سکتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ان چیزوں کو ریاکاری کی طرف موڑ دیتا ہے۔ آپ نماز پڑھ رہے ہیں اور اس نے اس میں ریاکاری کو شامل کر دیا تو ختم ہوا آپ کا وار۔ آپ نے روزہ رکھا لیکن اس نے آپ کی نیت پر حملہ کر کے اس میں ریاکاری کا عنصر داخل کر دیا تو آپ کا یہ ہتھیار بھی کند ہو گیا۔ اب اس کا کیا علاج ہو؟ سب سے بڑے طبیبِ امراض قلبیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کا علاج یہ تجویز فرمایا ہے کہ ان عبادات کے ساتھ نفلی عبادات کو شامل کیا جائے اور وہ نفلی عبادت بالکل اخفاء کے ساتھ ہو۔ اگر آپ نفلی انفاق کر رہے ہیں تو اس کی کیفیت حضورؐ نے یہ بیان فرمائی کہ داہنے ہاتھ سے خرچ کرو تو بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہ چلنے دو۔ نفلی نماز پڑھ رہے ہو تو ایسی تنہائی میں پڑھو کہ کسی کو پتہ نہ چلے اور کسی کے سامنے اس کا ذکر بھی نہ کرو۔ اس طرح نفس کے اس ہتھیار کو بھی کند کر دیا جا سکتا ہے۔ بہرحال یہ مجاہدہ مع النفس جہاد فی سبیل اللہ کی بنیاد اور فاؤنڈیشن ہے اور جو اس کو مستحکم کئے بغیر تعمیر اٹھانے کی کوشش کریں گے ان کی محنتیں اکارت جائیں گی۔ وقتی طور پر چاہے وہ بڑے جوش و خروش اور ہنگامے کی کیفیت پیدا کر لیں لیکن ان کی محنت نتیجہ خیز نہیں ہو گی۔ اس لئے کہ وہ بنیاد ہی موجود نہیں ہے جس پر یہ ساری تعمیر کھڑی ہونی ہے۔

نظریاتی اور فکری تصادم

اندر کی اس کشمکش کے بعد اب خارج میں کشمکش کا آغاز ہوتا ہے اور مجاہدہ مع النفس کی بنیاد پر جو پہلی منزل تعمیر ہوتی ہے اس کے لئے میں عنوان تجویز کر رہا ہوں "نظریاتی اور فکری تصادم" اس لئے کہ جب ہم مذہبی اصطلاحات بولتے ہیں تو ہمارے ذہنوں میں خواہی نخواہی وہی محدود تصورات آجاتے ہیں جو ہم نے ان اصطلاحات کے ساتھ وابستہ کر لئے ہیں۔ اس تصادم میں فکر فکر سے، نظریہ نظریہ سے اور خیال خیال سے ٹکرائے گا۔ آپ اللہ کے ماننے والے ہیں، وحی، نبوت، رسالت اور آخرت کے ماننے والے ہیں تو آپ کو اپنا یہ نظریہ و خیال اور عقیدہ و ایمان پھیلانا ہو گا، ورنہ بات کیسے آگے چلے گی؟ اور ظاہر بات ہے کہ آپ اپنے نظریات خلا میں تو پیش نہیں کر رہے۔ اس سے پہلے کچھ نظریات موجود ہیں۔ کچھ نظریات ہیں، یا شرک ہے یا وطن پرستی ہے یا الحاد ہے یا مادہ پرستی ہے یا مارکسزم ہے یا نیشنلزم ہے۔ آپ کو کفر و شرک، الحاد و مادہ پرستی، وطن پرستی اور مارکسزم وغیرہ کے مقابلے میں نظریۂ توحید پیش کرنا ہے۔ آپ اکیلے تو نہیں ہیں کہ آپ نے جو خیال پیش کیا وہ آسانی سے پھیلتا چلا گیا، بلکہ دلیل دلیل سے ٹکرائے گی اور آپ کو دنیا کے سامنے باطل نظریات کو باطل اور اپنے نظریئے کو حق ثابت کرنا ہو گا اور اس کے لئے ذرائع ابلاغ میں سے ہر ممکن ذریعہ استعمال کرنا ہو گا

جہاد فی سبیل اللہ کی اس منزل کے لئے دینی عنوان ہو گا "دعوت و تبلیغ"..... يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ۔ "اے نبیؐ پہنچایئے جو کچھ نازل کیا گیا ہے آپؐ پر آپؐ کے رب کی طرف سے"۔ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ۔ "اے نبیؐ دعوت دیجئے اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت کے ساتھ، موعظۂ حسنہ کے ساتھ اور ان کے ساتھ جدال کیجئے بہترین طریقے پر"۔ دیکھئے یہ جدال بھی باب مفاعلہ سے ہے۔ جدل کے معنی جھگڑا اور جب جھگڑا دو فریقوں کے مابین ہو تو یہ مجادلہ اور جدال ہو گا۔ اس آیۂ مبارکہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دی جا رہی ہے کہ عقائد کی سطح پر آپؐ مخالفین سے بہترین طریقے پر جدال کیجئے۔ وہ آپ کی مخالفت میں بہت گھٹیا اور اوچھے وار کریں گے لیکن آپؐ پوری

متانت و سنجیدگی اور پوری شرافت و مروّت کے ساتھ ان سے مجادلہ کیجئے اور اسلام کی حقانیت کا لوہا منوایئے! تو یہ دعوت و تبلیغ در حقیقت نظریاتی تصادم ہے۔

اب ظاہر بات ہے کہ یہ کام گھر بیٹھے تو نہیں ہو گا۔ آپ اپنے دھندے میں لگے رہے اور بس اپنے پروفیشن ہی کو چمکانے کی فکر میں رہے تو کیسے ہو گا؟ اور جان لیجئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہ کام تن تنہا نہیں کیا تھا۔ نبیؐ کا پہلا شکار چار افراد تھے۔ یہاں شکار کا لفظ آپ کو کہیں ناگوار محسوس نہ ہو۔ یہ لفظ حضرت مسیحؑ نے ایک جگہ استعمال کا تھا۔ جب آپ گلیلی جھیل پر پہنچے اور وہاں پر مچھیرے مچھلیاں پکڑ رہے تھے تو حضرت مسیحؑ نے فرمایا "او مچھلیوں کے پکڑنے والو آؤ کہ میں تمہیں انسانوں کا پکڑنا سکھاؤں"۔ انسان کو قائل کر کے ہم خیال بنانا اور نظریات و مقاصد میں اسے اپنا ساتھی بنالینا یہ انسانوں کا شکار ہے۔ تو حضورؐ کے پہلے شکار چار تھے..... (۱) زوجۂ محترمہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ (۲) چچازاد بھائی حضرت علیؓ جو زیر کفالت اور زیر تربیت تھے (۳) ایک غلام زید بن حارثہؓ جو بعد میں آزاد کر کے بیٹا بنالئے گئے اور (۴) نہایت گہرے دوست حضرت ابو بکر صدیقؓ۔ اب ایمان لانے کے بعد یہ حضرات دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری میں آپؐ کے دست و بازو بنے۔ لیکن اگر ابو بکرؓ یہ سوچتے کہ یہ کام تو انہی کا ہے، میرا تو نہیں ہے، رسولؐ تو وہ ہیں، میں تو نہیں ہوں، اللہ تعالیٰ "بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ" کا حکم تو رسولؐ کو دے رہا ہے، ابو بکرؓ کو تو نہیں دے رہا اور وہ اپنی تجارت میں لگے رہتے تو یہ بات کیونکر پھیلتی؟ بلکہ آپؓ ہمہ تن ہمہ وقت اسی کام میں لگ گئے، جس میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لگے ہوئے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپؓ کو جو وجاہت و حیثیت دی تھی اور مکہ کی سوسائٹی میں جو مقام و مرتبہ عطا کیا تھا اس کے نتیجے میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جھولی میں چھ ایسے شکار لا کر ڈالے جو ایک سے بڑھ کر ایک قیمتی تھا۔ عشرۂ مبشرہ میں سے چھ صحابہؓ وہ ہیں جو حضرت ابو بکرؓ کی تبلیغ سے ایمان لائے، جن میں عثمان غنیؓ بھی ہیں، طلحہؓ و زبیرؓ بھی ہیں، سعدؓ بن ابی وقاص اور عبدالرحمانؓ ابن عوف بھی ہیں (رضوان اللہ علیہم اجمعین)۔ ان میں سے ایک ایک شخص ایک ایک ہزار کے برابر ہے۔

ان کے علاوہ بہت سے نوجوان ہیں کہ جو آکر حضورؐ کے دامن سے وابستہ ہو گئے اور بلا تنخواہ ہمہ وقت کارکن کی حیثیت سے اس کام میں لگ گئے۔ ان میں خبابؓ بن الارت ہیں جو لوہاری کا پیشہ کرتے تھے۔ ابو جہل نے ستایا اوزار دکان وغیرہ ضبط کر لی۔ انہوں نے کہا اور کیا چاہئے، فھو المطلوب! فارغ ہوئے اور اب ہمہ تن حضورؐ کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔

حضرت بلالؓ کو بھی جب حضرت ابو بکرؓ نے خرید کر آزاد کر دیا تو وہ بھی آ کر لگ گئے۔ مصعبؓ بن عمیر کو گھر سے نکال دیا گیا تو وہ بھی رسول اللہ کے قدموں میں پہنچ گئے۔ یہ سب کس کام میں مصروف ہیں؟ حضورؐ سے قرآن سیکھ رہے ہیں اور آگے سکھا رہے ہیں۔ ادھر وحی نازل ہوئی' ادھر ان نوجوانوں نے اسے حضورؐ سے سیکھا' یاد کیا اور گھر گھر پہنچ کر جہاں بھی صاحب ایمان ہیں وہاں جا کر انہیں وہ قرآن سکھایا۔ خبابؓ بن الارت قرآن ہی تو پڑھانے گئے تھے حضرت سعیدؓ اور ان کی اہلیہ فاطمہؓ بنت خطاب کو۔ سورۂ طٰہٰ نازل ہوئی تھی وہ سکھانے گئے تھے۔ اس وقت حضرت عمرؓ آپہنچے' آگ بھبوکا بنے ہوئے۔ وہ تلوار لے کے حضورؐ کو قتل کرنے کے ارادے سے نکلے تھے۔ کسی نے کہا کہاں جا رہے ہو؟ پہلے اپنے گھر کی خبر لو' تمہاری بہن اور بہنوئی ایمان لا چکے ہیں۔ اس وقت حضرت عمرؓ ابن خطاب کے جلال کا کیا ٹھکانہ ہو گا' اس کا ہم تصور نہیں کر سکتے۔ جا کر دروازے پر دستک دی۔ گھر والوں کو معلوم ہوا کہ عمر آ گئے ہیں تو لرزہ طاری ہو گیا۔ خبابؓ بن الارت کو چھپایا گیا۔ وہ وہاں کیا کرنے گئے تھے؟ قرآن پڑھا رہے تھے۔ سورۃ طٰہٰ سکھا رہے تھے۔ تو جہاد کے اس مرحلے پر جسے ہم نے "نظریاتی و فکری تصادم" کا نام دیا سب سے بڑا ہتھیار قرآن مجید ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انقلابی جدوجہد کی نظریاتی اساس بھی قرآن مجید تھا اور نظریاتی تصادم کے مرحلے پر آپؐ کا سب سے بڑا ہتھیار بھی یہی قرآن ہی تھا۔ چنانچہ آپؐ کو اسی کی تبلیغ کا حکم ہوا: بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ "پہنچاؤ وہ جو نازل کیا گیا آپؐ پر آپؐ کے رب کی طرف سے"۔ اسی کے ذریعے آپؐ نے انذار فرمایا۔ وَ اُوْحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَکُمْ بِہٖ وَمَنْۢ بَلَغَ۔ "اور یہ قرآن مجھ پر وحی کیا گیا ہے تاکہ میں خبردار کروں اس کے ذریعے سے تمہیں اور جسے بھی یہ پہنچ جائے"۔ اسی سے تبشیر فرمائی۔ اسی کو ذریعۂ تذکیر بنایا: فَذَکِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ یَّخَافُ وَعِیْدِ ○ "پس آپؐ اس قرآن کے ذریعے سے اسے یاد دہانی کراتے رہیں جو میری تنبیہ سے ڈرتا ہے"۔

اب اگر آپ اپنے ماحول میں چاروں طرف دیکھیں تو کچھ چیزیں خود بخود عیاں ہو جائیں گی۔ کوئی دعوت اگر اس قرآن کو بائی پاس کر کے ہو رہی ہو تو وہ اس نہج پر نہیں ہو رہی ہے' جس پر محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کر رہے تھے۔ وقت کھپ رہا ہے' صلاحیتیں صرف ہو رہی ہیں' محنتیں لگ رہی ہیں لیکن اس نہج پر اور اس ترتیب کے ساتھ نہیں لگ رہی ہیں تو نتیجہ نہیں نکلے گا۔ البتہ اگر نیت صحیح ہے تو اجر ملے گا' اِلّا یہ کہ اس میں کوئی ریاکاری یا دنیاداری ہو تو

بات دوسری ہے ورنہ اگر خلوص ہے تو اجر ضائع نہیں ہو گا لیکن محنت نتیجہ خیز نہیں ہو گی۔

"نظریاتی و فکری تصادم" کے اس مرحلے اور "دعوت و تبلیغ" کی اس منزل کے لئے جامع ترین عنوان قرآن مجید کی ایک اصطلاح "شہادت علی الناس" بنے گی جو تبلیغ، تعلیم، تلقین، انذار اور تبشیر سب کو محیط ہے۔ یعنی "لوگوں پر گواہی دینا" ..... وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہم تک یہ بات پہنچائی ہی نہیں گئی۔ اس اصطلاح میں "علیٰ" مخالفت کا مفہوم ادا کر رہا ہے، اس لئے کہ یہ گواہی آخرت میں لوگوں کے خلاف جائے گی کہ اے اللہ ہم نے پہنچا دیا تھا۔ اب یہ خود ذمہ دار ہیں۔ "علیٰ" کا استعمال مخالفت میں ہوتا ہے اور "ل" کا حق میں۔ مثلاً اَلْقُرْاٰنُ حُجَّةٌ لَّکَ اَوْ عَلَیْکَ۔ "قرآن حجت ہے یا تمہارے حق میں یا تمہارے خلاف۔" گواہی کا معاملہ دو طرفہ ہوتا ہے۔ یہ ایک فریق کے حق میں ہو گی تو دوسرے کے خلاف جائے گی۔ سورۃ النساء میں فرمایا گیا: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ.....

"اے اہل ایمان، عدل و انصاف کے علمبردار بن کر کھڑے ہو جاؤ، اللہ کے حق میں گواہی دو، چاہے وہ گواہی تمہارے اپنے خلاف پڑ رہی ہو یا والدین کے یا رشتہ داروں کے خلاف۔ (النساء = ۱۳۵) یہ فریضہ شہادت علی الناس، امتِ مسلمہ کا اجتماعی نصب العین ہے۔

ہر مسلمان کا انفرادی نصب العین "عبادتِ رب" ہے..... اللہ کا بندہ بننا۔ لیکن جب اللہ کے بندے بن کر اجتماعی حیثیت میں یہ ایک امت بنتے ہیں تو اب بحیثیت امت انکا فرض کیا ہے؟ انفرادی سطح پر ان کا ہدف تھا۔ اَنْ تُجَاهِدَ نَفْسَکَ فِیْ طَاعَةِ اللّٰهِ اب اس اجتماعی سطح پر ان کی قوتوں اور ان کے مجاہدے کا ہدف ہو گا شہادت علی الناس: وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَهِیْدًا "ہم نے اسی لئے تو تمہیں بہترین امت (درمیانی امت) بنایا تاکہ تم ہو جاؤ گواہ تمام انسانوں پر اور رسول ہو جائیں گواہ تم پر"۔ اور "پر" کا مفہوم ذہن میں رکھئے کہ "خلاف" کا ہے۔ یعنی تاکہ تم قیامت کے دن لوگوں کے خلاف گواہی دے سکو کہ اے اللہ ہم نے پہنچا دیا تھا، اب یہ خود ذمہ دار ہیں مسئول ہیں اور رسولؐ تمہارے خلاف گواہی دیں کہ اے اللہ میں نے انہیں پہنچا دیا تھا۔

یہ بات ذرا آسانی سے حلق سے نیچے نہیں اترے گی' اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ اس آیت کے مفہوم کو سمجھنے میں عام طور پر غلطی ہوتی ہے۔ اس میں جو لفظ "علیٰ" ہے بنیادی طور پر اسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یہ مخالفت کے لئے آتا ہے حق کے لئے نہیں آتا۔ اس کا نقشہ بھی قرآن نے کھینچا ہے۔ میں نے اپنے کتابچے "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" میں تفصیل سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک بار حضورؐ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے فرمائش کی کہ مجھے قرآن سناؤ۔ انہوں نے کہا کہ حضورؐ آپ کو سناؤں' آپؐ پر تو نازل ہوا ہے۔ آپؐ نے فرمایا ہاں' لیکن دوسروں سے سننے میں اور لذت حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے سورۃ النساء پڑھنی شروع کی۔ چشم تصور سے دیکھئے کہ وہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مجلس میں گردن جھکائے' آنکھیں بند کئے ہوئے پڑھ رہے ہیں۔ جب اس آیت پر پہنچے۔ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا۔ تو حضورؐ نے فرمایا: حسبک' حسبک..... "بس کرو!" اور اب حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نظریں اٹھا کر دیکھتے ہیں تو حضورؐ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ کس لئے؟ کیونکہ یہ گواہی امت کے خلاف دینی پڑے گی کہ اے اللہ میں نے پہنچا دیا تھا' اب یہ ذمہ دار ہیں۔ اسی لئے گواہی لی حضورؐ نے حجۃ الوداع میں: اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟ "میں نے پہنچا دیا کہ نہیں؟" اور تمام حاضرین نے بیک زبان کہا۔ "اِنَّا نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَ اَدَّيْتَ وَ نَصَحْتَ.....

"ہاں حضورؐ ہم گواہ ہیں کہ آپ نے حق تبلیغ ادا کر دیا' حق امانت ادا کر دیا' حق نصیحت ادا کر دیا....." اس پر آپؐ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور فرمایا۔ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ..... اے اللہ تو بھی گواہ رہ' میں فارغ ہوا' میرا بوجھ اتر گیا۔ (اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا) وہ قولِ ثقیل آج میرے کاندھوں سے اتر کر ان کے کاندھوں پر آ گیا ہے۔ اور پھر فرمایا۔ فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَآئِبَ۔ پس پہنچائیں جو یہاں ہیں ان کو جو یہاں نہیں ہیں۔ میں سبکدوش ہوا' میرے کاندھوں کا بوجھ اب تمہارے کاندھوں پر ہے۔ تم گواہی دے رہے ہو کہ میں نے پہنچا دیا۔ اب تمہیں یہی گواہی پوری نوعِ انسانی سے لینی ہو گی ورنہ ہو سکتا ہے کہ روزِ محشر عدالتِ خداوندی میں دنیا تمہارے خلاف استغاثہ لے کر کھڑی ہو جائے کہ اے اللہ ان کے پاس تیرا دین تھا۔ انہوں نے ہمیں پہنچایا ہی نہیں تو ہم اس پر عمل پیرا کیسے ہوتے؟ یہ استغاثہ میدانِ حشر میں ہمیں مجرم ثابت کر سکتا ہے۔

اب آپ غور کیجئے کہ یہ کام گھر بیٹھے تو نہیں ہو گا۔ جہاد کے اس مرحلے میں پیسہ بھی صرف ہو گا اور جسم و جان کی توانائیاں بھی۔ صحابہ کرامؓ نے اس راہ میں بے دریغ خرچ کیا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جب ایمان لائے تو ان کے پاس چالیس ہزار درہم کا سرمایہ تھا اور جب تیرہ برس بعد ہجرت کے لئے جا رہے تھے تو سب ختم ہو چکا تھا۔ یہ سارا سرمایہ کہاں پگھل گیا؟ دین کی دعوت و اشاعت میں کھپا دیا۔ تنہا حضرت ابو بکرؓ نے چھ غلام اور کنیزوں کو خرید کر اللہ کی راہ میں آزاد کیا' جن میں ایک حضرت بلالؓ بھی ہیں۔ مسلمانوں میں جو بھی تنگدست تھے ان کی مدد کے لئے آپؓ کا ہاتھ ہر وقت کھلا تھا۔ پھر جو توانائی اور قوت کبھی پیسہ کمانے پر لگتی تھی وہ اب دین پر لگ رہی ہے۔ مال کے بڑھنے کا راستہ مسدود اور خرچ بے انتہا بڑھ رہا ہے۔ چنانچہ سارے کا سارا مال اس راستے میں خرچ ہو گیا۔ تو یہ ہے جہاد کا دوسرا مرحلہ' مجاہدہ مع النفس کی بنیاد پر قائم ہونے والی پہلی منزل..... فلسفیانہ انداز سے یہ نظریاتی و فکری تصادم کی منزل ہے اور دینی اصطلاحات میں اسے دعوت و تبلیغ کی منزل کہا جائے گا اور اس کا حاصل ہے شہادت علی الناس۔ اور اس میں مال و زر' جسم و جان کی صلاحیتیں' توانائیاں اور قوتیں اور اوقات کا کھپانا ناگزیر ہے۔ (جاری ہے)

بقیہ: خطابِ جمعہ

مختلف طبقات میں ان کے مسائل کا علیحدہ علیحدہ شعور بیدار کیا جائے اور بتدریج (CLASS CONSCIOUSNESS) اور (CLASS STRUGGLE) اور پیدا کر کے کمیونسٹ انقلاب کی راہ ہموار کی جائے۔ لہٰذا ہمیں اس برائی کو سر اٹھانے کا موقع ہی نہیں دینا چاہئے۔ انفرادی اور اجتماعی سطح پر اس قوم اور اس ملک کا ایک ہی مسئلہ ہے اور وہ ہے اسلام اور اس کا غلبہ..... پہلے اپنی ذات پر' پھر پاکستان پر اور پھر اگر اللہ ہمیں ہمت دے تو پورے کرۂ ارضی پر.....!! اسی پر ہماری دنیوی کامیابی اور عزت و وقار کا دارومدار ہے اور اسی پر ہماری اخروی فلاح بھی موقوف ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق عطا فرمائے!

نئی کارمینا
نظامِ ہضم کی اصلاح کے لیے زیادہ پُرتاثیر
نئی کارمینا
کارمینا
Carmina
انسان کی تن دُرستی کا زیادہ تر انحصار معدے اور جگر کی صحت مند کارکردگی پر ہے۔ اگر نظامِ ہضم درست نہ ہو تو دردِ شکم، بدہضمی، قبض، گیس، سینے کی جلن، گرانی یا بھوک کی کمی جیسی شکایات پیدا ہو جاتی ہیں جس کے سبب غذا صحیح طور پر جُزوِ بدن نہیں بنتی اور صحت رفتہ رفتہ متاثر ہونے لگتی ہے۔
پاکستان اور دنیا کے بہت سے ممالک میں ہمدرد کی کارمینا پیٹ کی خرابیوں کے لیے ایک مؤثر نباتی دوا کے طور پر شہرت رکھتی ہے۔ چونکہ یہ ہر گھر کی اہم ضرورت ہے اس لیے ہمدرد کی تجربہ گاہوں میں اس کی افادیت پر ہمہ وقت تحقیق و تجربات کا عمل جاری رہتا ہے۔ نئی کارمینا اسی تحقیق کا حاصل ہے۔ نئی کارمینا
کو پودینے کے جوہر اور دیگر مفید و مؤثر اجزا کے اضافے سے زیادہ قوی، پُرتاثیر اور خوش ذائقہ بنا دیا گیا ہے۔
نئی کارمینا نظامِ ہضم کو بیدار کرنے، معدے اور آنتوں کے افعال کو منظم و دُرست رکھنے میں زیادہ کارگر ہے۔
بچوں، بڑوں سب کے لیے مفید
نئی کارمینا
ہمیشہ گھر میں رکھیے
ہمدرد
ہم صحت کی خدمت کرتے ہیں
تحقیق، رُوحِ تخلیق ہے
Adarts
CAR- 4.88

اللہ اور رسولؐ کی اطاعت

مختار حسین فاروقی

یوں تو ہر مسلمان کے لئے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور فرماں برداری دین کا اہم حصہ اور بنیادی اہمیت کی چیز ہے مگر ایک سچی انقلابی جماعت کے فرد کے لئے جو اللہ کی توفیق کے طفیل خود کو دل و جان سے خدمت و اشاعت دین کے کام میں کھپا دینے کا متمنی ہو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی اہمیت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ پوری زندگی میں اطاعت کا یہ جذبہ ایمان کا حاصل بھی ہے اور مظہر بھی۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت اور وفاشعاری کے جذبات اگر صرف نوکِ زبان پر ہیں تو اطاعت بھی صرف ظاہری اور زبانی جمع خرچ تک محدود ہو گی اور اگر محبتِ خداوندی اور عشق رسولؐ کا جذبہ حرزِ جان بن گیا ہے اور رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے تو فرماں برداری کا یہ جذبہ بھی اتنا ہی گہرا ہو گا اور زندگی کے تمام گوشوں کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔

آیئے دیکھیں کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کے کون کون سے گوشے ہیں اور اس کے تقاضے کیا ہیں؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں یہ بات اگر ہمارے ذہن نشین ہو جائے تو پھر دوسرا قدم لامحالہ اپنے طرز عمل اور افکار و نظریات کا ایک بے لاگ تجزیہ ہو گا کہ ہم میں سے ہر فرد خود اس وقت کہاں کھڑا ہے؟

اطاعت کا معنی اور مفہوم

اطاعت کا لفظ "طوع" سے بنا ہے اور اس کے معنی ہیں "خوشدلی" اور "آزاد مرضی" یا خوشدلی اور اپنی آزاد مرضی سے کسی کام کا کرنا۔ اس معنی میں یہ لفظ قرآن مجید میں طوعاً و کرھاً کی ترکیب میں متعدد مقامات پر وارد ہوا ہے۔ اسی طرح لفظ "تطوّع" بھی "طوع" ہی سے بنا ہے اور اس میں بھی یہی مفہوم شامل ہے۔ طوع سے جب "اطاعت" کا لفظ باب افعال میں بنتا ہے اس کے معنی ذرا سے بدل جاتے ہیں یعنی کسی دوسرے انسان

دوسری ہستی یا کسی دوسری چیز کی فرماں برداری کرنا۔ اگرچہ اس میں بھی خوشدلی اور آزاد مرضی کا عنصر شامل ہے مگر ہے ذرا مخفی یعنی جبر اور اکراہ کے ساتھ جو حکم مانا جارہا ہو گا وہ بھی اطاعت ہی کہلائے گی مگر جیسے کہ آگے بیان ہو گا ایسی اطاعت جزوی ہو سکتی ہے مکمل اور ہمہ گیر طریق پر پوری زندگی میں ممکن نہیں ہے۔

اطاعت اور فطرتِ انسانی

شاید عام آدمی یہ سمجھتا ہے یا بے دین لوگوں کی طرف سے یہ تصور دانستہ عام کیا گیا ہے کہ ہم تو "آزاد" لوگ ہیں جو کسی دوسرے کی اطاعت نہیں کرتے اور یہ لوگ جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتے ہیں یہ لوگ پابند ہیں اور بہت سارے قاعدوں اور ضابطوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔

حقیقت میں شاید ایسا نہیں ہے۔ اور کلیتہً "آزاد" تو دنیا میں کوئی مخلوق نہیں ہے جمادات و نباتات تو پورے طور پر فطرت کے قوانین کے پابند ہیں ہی' حیوان بھی جو زندگی کے مقابلۃً اونچے درجے پر فائز ہیں مکمل طور پر خالق کائنات کے پہلے سے طے شدہ ضابطے اور قانون کے مطابق زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ حیوانات کا کھانا پینا' رہنا سہنا' غرض یہ کہ ہر ہر فعل ان کی جبلت کے تابع ہوتا ہے..... رہا انسان..... جو اشرف المخلوقات ہے تو اسے اللہ نے چونکہ اپنا خلیفہ بنایا ہے لہٰذا جہاں ایک طرف حضرت انسان اللہ تعالیٰ کے طے شدہ بہت سے ضابطوں کا پابند ہے اور اُن سے (اپنے سے کمتر مخلوقات کی طرح) سرِ مو انحراف نہیں کر سکتا وہاں یہ ابنِ آدم تھوڑی سی "آزادی" بھی رکھتا ہے اور اُسے یہ اختیار دیا گیا ہے کہ اپنی مرضی سے (زندگی کی شاہراہ پر) چاہے تو اسلام اور ایمان کی زندگی اختیار کر لے اور چاہے تو کفر اور تکذیب کی روش اختیار کر لے۔

اسلام میں داخل ہو کر بندہ تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کا پابند ہو ہی جاتا ہے "کفر" کی زندگی گزارنے والا شخص بھی کلیتہً "آزادی" سے زندگی نہیں گزارتا بلکہ نظریات و افکار و اعمال کی پیروی پر ارادتاً اور برائی کی طرف میلان کی وجہ سے دباؤ کے تحت بھی مجبور نظر آتا ہے۔ چنانچہ ایسا انسان سماجی دباؤ' معاشرتی رسوم و رواج اور اجتماعی قومی حالات کے تحت زندگی گزارنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں پاتا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ فطرتِ انسانی میں اپنی مرضی کو دبا کر کسی اور اعلیٰ تر ہستی کی حکم

بر آری کرنا شامل ہے۔ فرق صرف یہ رہے گا کہ مسلمان اپنی آزاد مرضی کو اپنے خالق اور رب کے قدموں اور چرنوں میں لاکر ڈال دیتا ہے اور اس کی اطاعت کے جذبے سے سرشار ہو کر " اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ○ " کا نغمہ الاپتا ہے اور کافر و مشرک 'پتھر کی مورتیوں' نفسانی خواہشوں اور اپنے ہی جیسے بعض دوسرے مجبور و محکوم بندوں کی اطاعت گزاری اور غلامی اختیار کر لیتا ہے۔ کسی ہوشمند اور غیر جانبدار شخص کے لئے فیصلہ زیادہ مشکل نہیں ہے کہ کون حقیقت سے قریب ہے اور کون فطرتِ انسانی کو مسخ کرنے کی پاداش میں اس سے کوسوں دور اور قرآن مجید کے الفاظ میں " ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِیْدًا " کا مصداق ہے

نتیجۃً انسان خواہی نخواہی کسی نہ کسی کی اطاعت کر رہا ہے۔ لیکن اس سوال کا جواب 'کہ آیا وہ اطاعت صرف دنیاوی زندگی اور یہیں کے مفادات تک محدود ہے جیسے قرآن مجید " اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا " کہتا ہے یا اس کے ثمرات حیات بعد الممات میں بھی خوشگوار ہوں گے 'اس بات پر منحصر ہے کہ انسان کا نصب العین اور مقصدِ زندگی کیا ہے؟ مقصد اگر صرف شکم پروری اور تن پروری ہے یا دنیاوی مفادات جمع کرنا ہے اور آرام و آسائش کے ساتھ زندگی گزارنا ہے تو انسان ایک مخصوص قسم کے نظامِ اطاعت کے حوالے ہو جائے گا جو اپنی نفسانی خواہشات کے اتباع سے شروع ہو گا۔ جسے قرآن مجید " اپنے نفس کو اپنا معبود بنا دینا " قرار دیتا ہے 'اور درہم و دینار کی بندگی سے ہوتا ہوا شرک پر ختم ہو گا' جس میں انسان کے لئے بے اطمینانی 'بے چینی 'کرب و الم اور بالآخر " عذابِ شدید " کے سوا اور کچھ نہیں۔

اور..... اگر مقصد اپنے خالق و مالک کو پہچاننا اور اس کی رضا اور خوشنودی ہے تو زندگی میں ترجیحات بالکل دوسری ہوں گی اور انجام بھی بالکل مختلف۔ یہی راستہ ہمارے دینِ اسلام کا راستہ ہے اور اسی راہ کے ہم سب مسافر ہیں۔ یہی راستہ انقلاب آفریں بھی ہے اور حیات بخش بھی لہٰذا اس کی قدرے تفصیل کی ضرورت ہے جو بعد کے مباحث میں آ رہی ہے۔

جزوی اطاعت یا کلّی اطاعت

قرآن مجید جس اطاعت کا مطالبہ اپنے ماننے والوں سے کرتا ہے وہ کلی اطاعت ہے نہ کہ جزوی! سورۃ البقرہ میں فرمایا گیا:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً

اے ایمان والو اسلام میں داخل ہو جاؤ پورے کے پورے (یعنی مکمل طور پر)

ربِّ ذوالجلال کے نزدیک یہی چیز پسندیدہ اور مطلوب ہے کہ بندہ یکسو ہو کر اس کی اطاعت اور بندگی اختیار کرے اور اپنی زندگی کے مختلف گوشوں میں ایک سے زیادہ "مطاع" بنانے کی بجائے صرف اور صرف خدائے واحد ہی کی اطاعت اور فرماں برداری کرے۔ چنانچہ یہ بات اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند اور اس کے غضب کو بھڑکانے والی ہے کہ آدمی کچھ معاملات میں خدا کی بندگی اور اطاعت بھی کرے اور کچھ گوشوں میں آسانی کی طلب اور مفاداتِ دنیوی کے حصول کے پیشِ نظر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کو پس پشت ڈال کر دوسروں کی پیروی بھی کرے۔ گویا زندگی کی وحدت کو مختلف گوشوں اور خانوں میں تقسیم کرے اور خدا اور شیطان کو بیک وقت خوش رکھنے کی پالیسی پر عمل پیرا نظر آئے۔ یہ صورتِ حال اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے اور ایسی عبادت اور اطاعت بھی انسان کے منہ پر دے ماری جانے والی چیز ہے اور آخرت کی میزان میں نہ صرف بے وزن ہے بلکہ الٹا موجبِ مواخذہ و سزا۔

اللہ تعالیٰ کی یہ ناراضگی بلا سبب اور بلا وجہ نہیں ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ شرک گناہِ کبیرہ ہے اور قرآن مجید میں دو جگہ اللہ تعالیٰ نے بڑے واضح اور واشگاف الفاظ میں یہ اعلان فرمایا ہے کہ یوں تو سب گناہ اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں مگر شرک تو ایسا گناہ ہے کہ اس کی معافی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا! ذرا غور کرنے پر آپ بھی اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ جزوی اطاعت یا اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ دوسروں کی بھی ایسی اطاعت اور پیروی جو اللہ تعالیٰ کے احکام کے علی الرغم اور خلاف کی جائے یقیناً شرک ہی کے ذیل میں آئے گی۔ قرآن مجید میں سورۃ الکہف میں فرمایا گیا۔

وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهٖٓ اَحَدًا

ترجمہ..... اور اللہ تعالیٰ اپنے حکم (نظامِ اطاعت) میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

اور اصولی طور پر اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور مخلوق میں سے کسی اور کی اطاعت کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان مبارک بہت واضح ہے۔

لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ

ترجمہ..... خالق (اللہ تعالیٰ) کی نافرمانی کر کے کسی مخلوق کی کوئی اطاعت نہیں کی جانی چاہئے۔

گویا اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے تابع تو بہت ساری اطاعتیں ہو سکتی ہیں اور دینِ اسلام میں اُن کا اپنا مقام بھی ہے مگر اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے سرتابی اور بغاوت کر کے یا اس کی جگہ پر کسی اور کی اطاعت کرنا صریح شرک ہے۔

یہیں سے یہ بات بھی واضح ہو گی کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ قرآن مجید میں اکثر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو جو لازمی قرار دیا گیا ہے تو یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے آزاد نہیں ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری ہے ہی بواسطہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم چنانچہ سورۃ النجم میں فرمایا گیا۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى

ترجمہ..... "اور (ہمارا رسولؐ) وہ اپنی خواہش سے نہیں کلام فرماتے بلکہ (ان کی) ہر بات ایک القائے ربانی ہوتا ہے جو ان کی طرف وحی کیا جاتا ہے۔"

اور سورۃ النساء میں مزید کھول دیا گیا۔

وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ

ترجمہ..... "اور جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی"۔

گویا اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کی پسند و ناپسند معلوم کرنے کا ہمارے پاس بجز لسانِ رسالت و نبوت کے کوئی اور ذریعہ ہی نہیں ہے۔ لہٰذا محمد رسولؐ اللہ کی اطاعت ہی اطاعتِ خداوندی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں دونوں اطاعتوں کا اکثر ساتھ ساتھ ذکر آتا ہے۔

مزید یہ کہ اسی بات کا دوسرا سرا یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ استاد کی اطاعت، والدین کی اطاعت، بزرگوں کی اطاعت، اہل علم و فضل کی اطاعت، حاکمِ وقت کی اطاعت، غرض سبھی اطاعتیں اپنی جگہ ضروری ہیں اور ان کا ایک اپنا اپنا مقام ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں اور احادیث نبویؐ میں بکثرت ملتا ہے۔ بنیادی بات وہی ہے کہ خالقِ کائنات کے احکام کے تابع رہ کر دیگر تمام اطاعتیں، فرماں برداریاں حتیٰ کہ نافرمانیاں تو جائز اور مستحسن ہیں مگر اُس کے احکام سے بغاوت اور سرکشی کرتے ہوئے جس کسی کی اطاعت کی جائے گی، اس کا شمار شرک میں ہو گا۔ جو یقیناً ہم سب کو ناپسند ہے لہٰذا کوشش یہ ہونی چاہئے کہ ہم اپنی زندگیوں میں یک رنگی اختیار کریں۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعتِ کلی کا قلادہ اپنے گلے میں ڈال لیں۔

اسی میں ہمارے لئے دین و دنیا کی بھلائی ہے وگرنہ اس اطاعت میں شرک کی آمیزش ہماری ساری محنت اور قربانی پر پانی پھیر دے گی۔

اس تفصیل میں جانے سے یہ بات بھی سمجھ میں آجائے گی کہ کلی اطاعت توحید کا عملی مظہر ہے اور اس اطاعت میں دوسروں کو شریک کرنا شرک ہی کی ایک قسم ہوگی خواہ اسے آپ خفی کیوں نہ شمار کریں۔ اس اصول کو ذرا آگے بڑھایئے اور عملی معاملات پر اسے منطبق کیجئے تو صاف طور پر سمجھ میں آئے گا کہ اگر نفس کی اطاعت ہو رہی ہے تو یہ نفس پرستی کہلائے گی' آباؤ اجداد کی اندھی تقلید کی جارہی ہے تو یہ آباء پرستی ہوگی' اور انسان اگر دولت کا پجاری بن بیٹھا ہے تو اسے زر پرستی کہا جائے گا۔ اسی طرح کسی ملک کے نظام اجتماعی میں قانونی و دستوری سطح پر اگر کوئی "شخصِ واحد" اپنی اطاعت کا طلب گار ہے تو یہ "خدائی کا دعویٰ" ہے جو فرعون نے کیا اور اگر کوئی قوم کسی دوسری قوم کو اپنا غلام بنا کر اس کو حیوانوں کی سطح پر رکھے ہوئے ہے تو یہ استبداد اور استعمار کی بدترین شکل ہے جس کی قرآن مجید میں مذمت فرمائی گئی۔ اور اسی پر بس نہیں' اس اصول کو آگے بڑھائے تو انسان کو "وطن پرستی" بھی شرک نظر آئے گی اور حاکمیتِ عوام کا نظریہ بھی شرک معلوم ہوگا۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ جزوی اطاعت کی یہ شکلیں جو جدید سیکولر دور میں بہت عام ہو گئی ہیں انسان کو اطاعتِ خداوندی سے منحرف کرنے والی ہیں اور ان سب کے ڈانڈے شرک ہی سے ملتے ہیں۔ یہ شرک ہی کے مختلف پرتو (SHADES) ہیں ان میں ظلمت و گمراہی کی شدت میں تو فرق ہو سکتا ہے مگر نوعیت میں کوئی تفاوت نہیں۔

اطاعت کے ساتھ ساتھ محبت بھی ضروری ہے!

اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا اقرار کرنا اور پھر پوری زندگی میں اس "اطاعتِ کلی" کے وعدے کو نبھانا بڑا کٹھن اور مشکل کام ہے مگر اس کو مزید مشکل بنانے والی چیز انسان کی خود اپنے اندر کی کیفیات و احساسات ہیں جو کبھی ایک جیسے نہیں رہتے بلکہ ہمہ وقت "مرغِ بادنما" کی طرح بدلتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم سب کا ذاتی تجربہ ہے کہ کبھی تو آدمی بڑے شوق سے نماز پڑھتا ہے' دل کی آمادگی کے ساتھ اطاعت کرتا ہے مگر بسا اوقات ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے کہ انسان کو نماز کے لئے بھی اپنے آپ پر جبر کرنا پڑتا ہے۔

اگر یہ کیفیت کبھی کبھی ہو اور وقتی و عارضی ہو تو قابلِ عفو ہے اور اس کی توجیہہ کسل'

ضعف اور دیگر اسباب سے کی جا سکتی ہے۔ مگر جب یہ کیفیت پھیلنی شروع ہو اور شوقِ عبادت اور جذبۂ فدویت گھٹتا چلا جائے تو یقیناً خطرے کی بات ہے۔ ایسے ہی ایک گروہ کا نقشہ قرآن مجید میں مندرجہ ذیل الفاظ میں کھینچا گیا ہے جو اسی قسم کے روحانی مرض کے اگلے درجے میں پہنچ چکے تھے۔

لَا يَأْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ

ترجمہ..... "وہ نماز کے لئے نہیں آتے مگر کسلمندی کے ساتھ اور نہیں خرچ کرتے مگر بڑی ناگواری کے انداز میں۔" (سورۃ التوبۃ)

جو لوگ روحانی اور باطنی طور پر اس درجہ بھٹک جائیں تو قرآن مجید کی اصطلاح میں ایسے لوگوں کو "منافق" کے لفظ سے موسوم کیا گیا ہے اور دل کا یہ روگ ایسی بیماری ہے جس کا لیبل ہم میں سے کوئی بھی برداشت نہیں کرنا چاہتا اور ہے بھی یہی صحیح کہ برداشت بھی نہیں کرنا چاہئے کہ منافق وہ ہے کہ دنیا بھی گئی اور آخرت بھی خراب!

"نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم ! نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے" اور آخرت میں ان کا عبرتناک انجام ان الفاظ میں وارد ہے۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ

ترجمہ..... "یقیناً منافقین آگ کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے"۔

لہٰذا شعوری طور پر کوشش ہونی چاہئے کہ آدمی اس کیفیت کو اولاً تو اپنے اوپر مستولی نہ ہونے دے اور اگر اس کا دیرپا سایہ پڑتا ہوا نظر بھی آئے تو اس سے جان چھڑانے کی فکر کرے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نفاق کے اس مہلک مرض سے بچائے۔ آمین۔ اس لئے کہ منافقت کے بالکل برعکس "ایمان" کی نشانی کے طور پر جو باتیں قرآن مجید اور احادیث نبویؐ میں مذکور ہیں اس سے بندۂ مومن کی جو تصویر بنتی ہے وہ بالکل دوسری انتہا پر ہے۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز سے متعلق ہماری رہنمائی اور معیارِ حقیقت کے طور پر اپنی کیفیت یوں بیان فرمائی۔ قُرَّةُ عَيْنِىْ فِى الصَّلٰوةِ "میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے" اور..... اَلصَّلٰوةُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِيْنَ نماز بندۂ مومن کی معراج ہے۔

یا یوں فرمایا کہ دین کا بلند ترین مقام یہ ہے کہ

اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ

ترجمہ..... "کہ تو اللہ کی بندگی کرے گویا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے اگر ایسا نہیں تو وہ تو تجھے دیکھ ہی رہا ہے"۔

یا فرمایا کہ جب تک انسان اپنے بھائی کے لئے وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لئے کرتا ہے اس وقت تک مومن نہیں ہے مزید بر آں اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لازمی حصے اور منطقی تقاضے کے طور پر فرمایا کہ۔

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّلَدِہٖ وَ وَالِدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ

ترجمہ..... "تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اسے اس کی اولاد، اس کے والدین اور تمام انسان سے بڑھ کر محبوب نہ ہو جاؤں"۔

بات بالکل واضح ہے کہ اگر کسی کی اطاعت اس طور پر کرنی ہے کہ دل میں کسل اور جبر و اکراہ کی کیفیت نہ ہو تو اس ہستی سے محبت کا ہونا شرطِ لازم قرار پائے گا۔ اور جیسے جیسے اطاعت کامل اور مکمل ہوتی چلے جائے گی محبت کا یہ جذبہ بھی اپنے کمال کی حدوں کو مس کرتا ہوا نظر آئے گا۔ اطاعت اللہ تعالیٰ کی ہو اور چاہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی، جذبۂ فدویت و محبت کے بغیر ممکن نہیں۔ اگرچہ محبت خداوندی اور محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا اپنا مقام ہو گا محبت خداوندی برتر اور سب سے اوپر ہو گی اور محبت رسولؐ اور عشق محمدیؐ بہرحال اور بہرطور اس کے تابع ہی ہو گا۔ چنانچہ اطاعتِ کامل کے ساتھ جو محبت کامل کا درجہ مطلوب ہے، قرآن میں اس کا ذکر سورۃ البقرہ میں ان الفاظ میں ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَنْدَادًا یُّحِبُّوْنَھُمْ کَحُبِّ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ

ترجمہ..... "اور لوگوں میں وہ بھی ہیں جو اللہ کو چھوڑ کر دوسری ہستیوں کو اس کا مدِمقابل بناتے ہیں اور ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی محبت اللہ سے ہونی چاہئے۔ اور اہلِ ایمان سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں"۔

معلوم ہوا کہ اہل ایمان کی شدید ترین محبت اللہ تعالیٰ سے ہے اور اس کے برعکس کافروں اور مشرکوں کا نقشہ یہ سامنے آیا کہ "وہ جن ہستیوں کی خدا کو چھوڑ کر اطاعت کرتے ہیں ان ہستیوں سے ایسی ہی محبت کرتے ہیں جیسے خدا سے کرنی چاہئے گویا..... حاصل کلام کے طور پر یہ بات ذہن نشین کرنا چاہئے کہ اطاعت اور محبت کا چولی دامن یا جسم و جان کا تعلق ہے

اسوۂ رسولؐ اور اتباع کا جذبہ

اطاعت اور فرماں برداری میں جو چیز مضمر ہے اور پوشیدہ سمجھی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ہر حکم کی اطاعت ضروری ہے اور ہر حکم بجالانا لازمی ہے۔ اور جیسا کہ اوپر ذکر ہوا دین میں اطاعتِ کلی مطلوب ہے نہ کہ جزوی! یعنی کل زندگی میں اور روز مرّہ کے ذاتی اور نجی سے لے کر اجتماعی اور قومی معاملات تک میں یہ اطاعت درکار ہے۔

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا یہ راستہ جب انسان عملاً اور جذبہ صادق کے ساتھ اختیار کرتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے واضح اور لفظاً (IN BLACK & WHITE) احکام یقیناً زندگی کے بہت سے معاملات کا احاطہ کرتے ہیں لیکن زندگی کی بہت سی دشوار گزار گھاٹیوں میں رہنمائی کے لئے صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور اسوۂ حسنہ کا ایک "سراجِ منیر" ہی بندۂ مومن کی رہنمائی کرتا ہے جو دُور صراط مستقیم کے پرلے سرے پر پوری آب و تاب سے روشن نظر آتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ روز مرّہ زندگی کے عام معاملات میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی انسانی زندگی ہی ہمارے لئے مشعل راہ ہے اور اس کا زیادہ حصہ بھی حکماً نہیں "بیانیہ" انداز میں ہے جس سے حضورؐ کے معمولاتِ زندگی کا ایک خاکہ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔

عبادات اور احکام خداوندی کے ساتھ اسوۂ رسولؐ کا یہ نقشہ جس میں شادی بیاہ، نکاح و طلاق، رہن سہن، نشست و برخاست اور دیگر معاشی و معاشرتی معاملات میں ہماری رہنمائی موجود ہے یہی اسوۂ رسولؐ ہے اور حقیقتاً "سنت" کا لفظ اسی پوری زندگی کی روش پر ہی بولا جاتا ہے جو نبی اکرمؐ کی حیات طیبہ میں ہمیں نظر آتی ہے۔ کہ ایک شخص عبد کامل کے مقام پر فائز ہو کر دین کی جدوجہد اور اس کی تبلیغ و تعلیم میں کس طرح منہمک نظر آتا ہے۔

اللہ اور اس کے رسولؐ کے واضح احکامات کی تعمیل اور فرماں برداری تو اطاعت کہلائے گی جبکہ غیر واضح اور اشارہ و کنایہ بلکہ چشم ابرو کے اشارے سے دیئے گئے احکام کی بجا آوری کے لئے قرآن مجید کی اصطلاح "اتباع رسولؐ" کی ہے۔ اور اگر کسی کو آخرت کی بھلائی مطلوب ہے تو سر جھکا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اطاعت اور اتباع اختیار کر لے، کامیابی یقینی ہے۔ اور کیوں نہ ہو قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ

وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○ (آل عمران ۳۱)

ترجمہ..... کہہ دیجئے (اے نبیؐ) اگر تم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو میرا اتباع کرو (نتیجۃً) اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا اور اللہ غفور ورحیم ہے۔

اتباعِ رسولؐ سے مراد ہے کہ آدمی اپنی وضع قطع، شکل وصورت، اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے کے انداز، آمدورفت حتیٰ کہ زندگی کے پوشیدہ معاملات تک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کو اختیار کرلے۔ اور سمجھے اور یقین کرے کہ ہر معاملے میں اس لئے ایک طریقہ اور اسوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں موجود ہے۔ اس کی تلاش کرے، اس کو سیکھنے کی کوشش کرے اور جیسے جیسے تفاصیل معلوم ہوتی چلی جائیں ان کو دائرۂ عمل میں لاتا چلا جائے اور حرزِ جان بناتا چلا جائے۔ یہ مقام بلند ایسا ہے کہ اتباعِ رسولؐ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات زندگی سے ایک گونہ مشابہت تو پیدا ہوتی ہی ہے، انسان خدا کا "محبوب" بن جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرنے لگ جاتے ہیں۔ اللہ اللہ اتنا اونچا درجہ جو ابنِ آدم حاصل کرسکتا ہے!

اتباعِ رسولؐ کے ذکر میں ایک پہلو عام طور پر نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ باریک اور چھوٹے چھوٹے معاملات میں تو پیروی کا معاملہ انتہا کو پہنچ جاتا ہے مگر (جیسا کہ انسانی فطرت ہے) اس انہماک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی حیاتِ طیبہ کے چند نمایاں ترین اور سورج سے زیادہ روشن گوشے ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر کچھ لوگ ہمارے معاشرے میں ایسے بھی مل جائیں گے۔ جنہیں مسنون دعائیں، اذکار تسبیحات، نشست وبرخاست، وضع قطع حتیٰ کہ کہ استنجاء کے لئے ڈھیلوں کی مطلوبہ تعداد کی تو فکر دامن گیر رہے گی (اور رہنی چاہئے) مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی زندگی کے بعض نمایاں گوشے مثلاً قرآن مجید کا یاد ہونا، رات کی طویل نمازیں، تبلیغ دین اور اس کے لئے محنت اور جدوجہد، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، حلال کمانے اور کھانے کی کوشش اور سب سے بڑھ کر اقامتِ دین کے لئے محنت اور اپنے آپ کو کھپا دینے کا جذبہ جس میں ہجرت وجہاد کے مراحل محسوس ومشہود ہوں، ان کی زندگی سے بالکل غائب ہوں گے۔ یہ عدم توازن ہماری کم علمی اور ماحول میں دین سے مجموعی دوری کے سبب سے ہے۔ اس سے شعوری طور پر بچنے کی ضرورت ہے۔ ذاتی اور اجتماعی معاملات میں اور نجی اور گھریلو معاملات میں ہر پہلو سے اتباعِ رسولؐ کا یہ جذبہ یکساں طریق پر پروان چڑھنا چاہئے۔ ورنہ شدید

عدم توازن پیدا ہو گا جس سے نہ صرف انسان کی اپنی شخصیت یک رخی ہو جائے گی بلکہ سوچ اور فکر میں کجی پیدا ہونے کا اندیشہ بھی ہے جو نہایت خطرناک ہے۔

آخری بات

اطاعت، محبت اور اتباعِ رسولؐ کی جو وضاحت اوپر بیان ہو چکی ہے اس کو معیار بنا کر اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیں تو ایک تضاد ہمیں نظر آئے گا۔ قول اور فعل کا تضاد، ظاہر و باطن کا تضاد، بلاشبہ ہم خدا پرستی اور اتباعِ رسولؐ کو چھوڑ کر دنیا پرستی میں مبتلا ہو چکے ہیں اور آخرت کی زندگی پر دنیا کی زندگی کو ترجیح دے کر اسی "کم تر" کے حصول کے لئے رات دن سر توڑ کوششوں میں مصروف ہیں۔ ہر طرف یہی دوڑ نظر آئے گی اور آج کے غیر مسلم اور مغربی معاشرے کا تو ذکر ہی کیا، خود مسلمان معاشروں میں بھی "ڈالر" اور دنیاوی عزت و جاہت کا حصول ہی مطمحِ نظر اور نصب العین ہو کر رہ گیا ہے۔

اندریں حالات عام مسلمان تو خواب غفلت میں ہیں ان سے کیا شکوہ! غنیمت ہیں وہ لوگ جو اس غفلت سے بیدار ہو کر ہوش میں آئے ہیں اور خدا اور رسولؐ کی طرف سے عائد کردہ ذمہ داریوں کو پہچان کر ان کی بجا آوری میں مشغول ہیں۔ ایسے خوش بخت لوگوں پر دوہری ذمہ داری عائد ہوتی ہیں۔

اولاً خود بھی جاگتے رہنا ہے، دنیا و مافیہا کی محبت میں گرفتار نہ ہو کر صرف آخرت میں خدا کی رضا کی کوشش کرنا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دین پر عمل کرنا ہے اور دوسروں کے لئے بھی نمونہ بننا ہے اور اس کے غلبہ اور نفاذ کے لئے بھی سر توڑ کوشش کرنا ہے حتیٰ کہ جان کی بازی بھی لگانا پڑے تو اس سے بھی گریز نہیں کرنا ہے۔ ثانیاً اپنے اعزہ و اقارب، حلقہ احباب اور محلہ اور شہر میں حسب استطاعت دوسروں کو بھی اس خوابِ غفلت سے جگانا ہے۔ دلسوزی اور ہمدردی کے ساتھ انہیں اپنے نقصان کا احساس دلانا ہے اور انہیں بھی اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کی طرف لانا ہے ان کے اندر بھی وہی سوز دروں اور جذبۂ عمل پیدا کرنا ہے کہ وہ خود بھی ایک داعی بن کر کھڑے ہوں اور دوسروں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوں۔

ثالثاً اس تمام عرصے میں اور زندگی کے تمام گوشوں میں رخصت کے بجائے عزیمت کا پہلو اختیار کرنا ہے، تاکہ بہت سے دوسرے ضعیف اور کمزور ساتھیوں کو نشان راہ مل سکے

(باقی صفحہ پر)

معدے کی تیزابیت، بدہضمی اور بھوک کی کمی کے لیے

لیکوڈ
گیسٹوفل

معدے کی تکالیف میں آرام کے لیے
گیسٹوفل ہمیشہ گھر میں رکھیے

تحقیق کی روایت۔ معیار کی ضمانت

QD – 6

مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی شخصیت

اور

مولانا ابوالکلام آزاد

کے بارے میں ان کے خیالات و تأثرات

★★★

تحریر : مولانا محمد اسحاق بھٹی

(بشکریہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور)

★★

مولانا محمد اسحٰق بھٹی کی یہ تحریر ماہنامہ قومی ڈائجسٹ کے اکتوبر ۸۸ء کے شمارے میں صرف "مولانا سعید احمد اکبر آبادی" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ اور اس پر ادارہ قومی ڈائجسٹ نے حسب ذیل نوٹ درج کیا ہے :

سابق صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق شہید کے اُستادِ محترم، برِ صغیر کی ایک بلند پایہ علمی شخصیت، کلکتہ کے ایک دینی مدرسے کے پرنسپل، مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شعبۂ اسلامیات کے رُوحِ رواں، "ندوۃ المصنفین" کے بانی، رسالہ "برہان" کے مدیرِ اعلیٰ، قریباً ایک درجن کتابوں کے صاحبِ نظر مصنّف اور منجھے ہوئے مقالہ نگار کی علمی کاوشوں اور داخلی و خارجی زندگی کا نقاب کُشا تذکرہ جو بہت سے لوگوں کے لیے حیران کُن بھی ہوگا اور معلومات افزا بھی ! ایک ایسے شخص کی دِل کُشا باتیں جس کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا واقعتاً تصنیف و تالیف رہا۔

اُن کے قریبی دوست محمد اسحاق بھٹی کے قلم سے

اس تعارفی نوٹ سے تو گمان ہوتا ہے کہ اس میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی شخصیت اور اُن کے سوانح و خدمات کا تذکرہ ہوگا لیکن ۱۲ صفحات پر پھیلی ہوئی اس تحریر کے ۹ صفحات

اس تقریر پر مشتمل ہیں جو مولانا موصوف نے ۲۷ مارچ ۱۹۸۴ء کو جناح ہال لاہور میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے سالانہ محاضرات کی اس نشست میں کی تھی جس کا عنوان تھا " مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت و کردار اور ان کے علمی و عملی کارنامے " ـــــ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس کے عنوان میں چند الفاظ کا اضافہ کر کے اسے موضوع اور مشمولات کے مناسب بنا دیا ہے ـــــ یہ تقریر اب سے بہت پہلے ٹیپ سے اتار کر انجمن کے مجلہ 'حکمت قرآن' میں شائع کر دی گئی تھی ۔ بعد ازاں اسے 'حکمت قرآن' ہی سے لے کر ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری نے کچھ توضیحی اور بعض اختلافی حواشی کے ساتھ نہایت آب و تاب کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کیا تھا، جس کا عکس راقم کی کتاب " جماعت شیخ الہندؒ " کا مستقل جزو بن چکا ہے ! ـــــ اب مولانا اسحٰق بھٹی صاحب کی یہ تحریر ایک اضافی شہادت کے طور پر شائع کی جا رہی ہے ، تاکہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے جو خیالات اپنی اُس تقریر میں ظاہر فرمائے تھے اُن کی ان کے ساتھ نسبت میں کسی کو شک نہ رہے ـــــ مولانا اسحٰق صاحب کا حافظہ قابلِ داد بلکہ قابلِ رشک ہے کہ انہوں نے محض سن کر تقریر کو اتنی تفصیل اور صحت کے ساتھ تحریر فرما دیا ـــــ اس تقریر کے علاوہ اس تحریر میں چند باتیں مزید بھی ہیں جو یقیناً قارئین کی دلچسپی کی موجب ہوں گی ـــــ

اسرار احمد

۱۹۶۹ء کے مئی کا مہینہ تھا اور دن کے دس گیارہ بجے کا وقت تھا کہ ایک صاحب ادارہ ثقافت اسلامیہ تشریف لائے اور سب سے پہلے مولانا محمد حنیف ندوی کے کمرے میں آئے (اب کئی سال سے اس کمرے میں میرا دفتر ہے) حسنِ اتفاق سے میں وہیں بیٹھا تھا۔ لاہور کے مشہور پبلشر شیخ محمد اشرف مرحوم ان کے ساتھ تھے۔ شیخ صاحب نے ان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا : " یہ ہیں۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی — !"

مولانا حنیف ندوی ایک دم کھڑے ہو گئے۔ میں بھی جلدی سے اُٹھا اور دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا۔

رفقائے ادارہ میں سے سید محمد جعفر شاہ پھلواروی اور رئیس احمد جعفری کو اطلاع دی گئی، وہ بھی آ گئے اور یہ حضرات ان سے باتیں کرتے رہے۔ میری حیثیت سامع کی تھی۔ میں خاموش بیٹھا ان کی باتیں سُنتا رہا۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی کو میں نے پڑھا تو تھا لیکن ان کو دیکھنے اور ان کی باتیں سُننے کا اتفاق آج پہلی دفعہ ہوا۔ پورا قد، مناسب جسم، نہ فربہ نہ دھان پان۔ گندمی سا رنگ، سر پر قراقلی ٹوپی۔ پاجامہ، کرتہ اور بھنڈی شیروانی زیبِ تن۔ معتدل ڈاڑھی، سیاہ اور سفید بالوں کا خوبصورت مجموعہ۔ گفتگو کا انداز نہایت دھیما۔ بات چیت میں توازن کا غلبہ اور لہجے میں اعتدال کی فراوانی۔

اس سے دو سال قبل ۱۹۶۷ء میں مولانا حنیف ندوی کی کتاب " عقلیاتِ ابن تیمیہ " شائع ہوئی تھی جو تبصرے کے لیے مولانا سعید احمد اکبر آبادی کو بھیجی گئی تھی۔ انہوں نے اپنے ماہانہ رسالے " برہان " میں اس پر تبصرہ کیا تھا۔ مولانا ندوی کو اس تبصرے کے بعض پہلوؤں سے متعلق مولانا اکبر آبادی سے دوستانہ شکوہ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مولانا اکبر آبادی نے یا تو کتاب اچھی طرح پڑھی نہیں یا ایک علمی موضوع کے بارے میں معاصرت سے کام لیا ہے یا پھر اس لیے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا کہ وہ ان کے حلقے سے تعلق نہیں رکھتے۔ اس کا ذکر مولانا ندوی اپنی محفلِ احباب میں کئی دفعہ کر چکے تھے۔ اب مولانا اکبر آبادی تشریف لائے تو خیر خیریت کے بعد مولانا ندوی نے اس موضوع پر گفتگو شروع کر دی۔ مولانا ندوی کا انداز گفتگو قدرے تیز

بلکہ "جارحانہ" تھا۔ مولانا اکبر آبادی کا اسلوب کلام ان کے مقابلے میں نرم بلکہ کہنا چاہیے "مدافعانہ" تھا۔ وہ تقریباً پون گھنٹہ یہاں رہے۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ کی علمی و تصنیفی سرگرمیوں کے بارے میں چند باتیں پوچھیں اور رفقائے ادارہ سے ندوۃ المصنفین، ہندوستان کے دیگر علمی و تحقیقی اداروں اور بعض اشخاص سے متعلق ان سے دریافت کیا۔ اور وہ تشریف لے گئے۔

اس سے کوئی پانچ سال بعد وہ ڈاکٹر اسرار احمد کی دعوت پر انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام منعقدہ قرآنی محاضرات میں شریک ہوئے۔ اس موقعے پر میں بھی مدعو تھا اور مجھے "برصغیر پاک و ہند میں علم حدیث، عہد تابعین میں" کے موضوع پر مقالہ پیش کرنا تھا۔ اب پہلی مرتبہ ان سے ہم کلام ہونے کا موقع ملا۔ اس وقت میری کتاب سلسلہ "فقہائے ہند" کی چند جلدیں چھپ چکی تھیں اور ان کے مطالعے میں آچکی تھیں۔ ان کے بارے میں مجھ سے بعض باتیں پوچھیں، کچھ مفید مشورے دیے۔ برصغیر کے علما و فقہا کے متعلق گفتگو ہوئی اور از راہ کرم میرے کام کی تحسین فرمائی۔

مارچ ۱۹۸۴ء میں وہ پھر پاکستان آئے۔ اب کی مرتبہ قاضی اطہر مبارک پوری اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ فارسی کے صدر ڈاکٹر نذیر احمد بھی ان کے ساتھ تھے۔ ۲۲ مارچ کو یہ تینوں حضرات ادارہ ثقافت اسلامیہ تشریف لائے لیکن اس دن میری طبیعت ناساز تھی اور میں دفتر نہیں جا سکا تھا۔ دوسرے حضرات بھی دفتر سے جا چکے تھے۔ یہ تینوں بزرگ مجلس ترقی ادب کے ڈائریکٹر جناب احمد ندیم قاسمی سے ملے اور میرا ذکر کیا۔ اتفاق سے قاسمی صاحب کے پاس اس وقت جناب میرزا ادیب صاحب تشریف فرما تھے۔ میرے گھر سے تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر ان کا مکان ہے۔ وہ میرے مہربان ہیں اور ایک دوسرے کے ہاں ہماری آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہے۔ قاسمی صاحب نے میرزا ادیب صاحب کی معرفت مجھے پیغام بھیجا کہ ہندوستان کے یہ اہل علم بزرگ پنجاب گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور تمہیں ملنا چاہتے ہیں۔ میں شام کو وہاں پہنچا تو یہ حضرات موجود نہیں تھے، کہیں باہر تشریف لے گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد آئے تو نہایت تپاک سے ملے اور ایسے معلوم ہوا کہ ہم میں سے کسی کے درمیان کوئی ذہنی فاصلہ نہیں ہے اور سب ایک ہی نقطۂ فکر کے حامل ہیں۔

قاضی اطہر مبارک پوری ہندوستان کے ممتاز سکالر اور عربی اور اردو دونوں زبانوں کی متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ اگست ۱۹۸۴ء میں ان کو عربی زبان کی خدمت کے سلسلے میں صدر ہندوستان کی طرف سے صدارتی ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ ۱۹۷۸ء میں بھی یہ لاہور آئے تھے اور مولانا عطاء اللہ حنیف (مکتبہ سلفیہ شیش محل روڈ، لاہور) کے ہاں گئے تھے تو مجھے بھی یاد فرمایا تھا اور میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس طرح مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور قاضی اطہر مبارک پوری سے پہلے سے آشنائی تھی۔ ڈاکٹر نذیر احمد کی بعض کتابیں اور ان کے کچھ مضامین و مقالات تو ہندوستان کے بعض رسائل و جرائد میں پڑھے تھے لیکن ان سے ملاقات پہلی دفعہ ہوئی۔

قاضی اطہر مبارک پوری نے اس ملاقات میں عربی زبان کی اپنی تصنیف شدہ چند کتابیں از راہ نوازش مجھے عطا فرمائیں۔ مولانا اکبر آبادی نے میری حقیر سی تصنیفی خدمات کو سراہا اور "المعارف" کو (جو میری ادارت میں شائع ہوتا ہے) معیاری رسالہ قرار دیا۔ اس کے بعض مضامین کو جو اس عاجز نے لکھے ہیں، بالخصوص لائق تعریف گردانا۔ یہ ان کی مہربانی اور مجھ پر شفقت کی دلیل تھی اور ظاہر ہے ان کی یہ باتیں میرے لیے حوصلہ افزائی اور مسرت کا باعث تھیں۔ مجموعی اعتبار سے ادارہ ثقافت اسلامیہ کی علمی کاوشوں اور اس کی مطبوعات کی انہوں نے بہت تحسین فرمائی۔ بلاشبہ وہ اونچے مرتبے کے اہل علم اور صاف دل صاحب قلم تھے اور ان کی یہ باتیں ان کے وسعت قلب کی آئینہ دار تھیں۔

میں شام کو ساڑھے چھ بجے ان سے ملا تھا، گیارہ بجے تک ان کی مجلس میں رہا۔ اس اثنا میں بہت سی باتیں ہوئیں اور پاکستان اور ہندوستان کے مختلف اداروں اور افراد کی علمی سرگرمیوں کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔

یہ تینوں حضرات حکومت پاکستان کی دعوت پر آئے تھے اور اسلام آباد کی ایک سرکاری تقریب میں شرکت کے بعد واپس لاہور ہوئے تھے۔ یہ رات انہوں نے حکومت کے مہمان کی حیثیت سے پنجاب گیسٹ ہاؤس میں بسر کی۔ دوسرے دن ۲۴ مارچ کو علی الصبح قاضی اطہر مبارک پوری اور ڈاکٹر نذیر احمد تو اپنے وطن ہندوستان تشریف لے گئے لیکن مولانا سعید احمد اکبر آبادی اپنے داماد پروفیسر محمد اسلم (شعبہ تاریخ پنجاب یونیورسٹی) کے مکان پر سمن آباد چلے گئے۔ انہوں نے ڈاکٹر اسرار احمد کے منعقد کردہ محاضراتِ قرآنی میں شرکت کرنا تھی۔

۲۵ مارچ سے ۲۸ مارچ (۱۹۸۴ء) تک جناح ہال (لاہور) میں انجمن خدام القرآن کی طرف سے ڈاکٹر اسرار احمد نے محاضراتِ قرآنی کا اہتمام کیا۔ اس کی صدارت کے فرائض مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے انجام دیے۔ ۲۷ مارچ کی شب کو خود مولانا اکبر آبادی کی تقریر تھی۔ تقریر کا موضوع تھا: "مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت و کردار اور ان کے علمی و عملی کارنامے"۔ تقریر سے پہلے میں نے ان سے کہا بڑا عجیب و غریب موضوع آپ کو دیا گیا ہے۔ وہ مسکرائے اور کہا: "اچھا جو خدا کو منظور"

ہال میں کرسیوں کا انتظام تھا اور تقریر سے پہلے ہی ان پر سامعین نے قبضہ جما لیا تھا۔ نیچے فرش پر بھی بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ سٹیج بھی حاضرین سے بھر گیا تھا۔ گیلری بھی پُر تھی اور ہال اچھی خاصی وسعت کے باوجود اپنی تنگ دامانی پر نالاں تھا۔ برآمدے میں بھی لوگ کھڑے تھے اور باہر بھی جہاں تک لاؤڈ سپیکر کی آواز پہنچ سکتی تھی، لوگ موجود تھے۔ میرے خیال میں جناح ہال نے اتنا بڑا مجمع کبھی نہیں دیکھا ہوگا، جتنا آج مولانا ابوالکلام آزاد سے متعلق مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی تقریر میں دیکھا۔

مولانا ابوالکلام کے انہوں نے کئی واقعات بیان کیے۔ طرزِ ادا نہایت دلچسپ اور اندازِ کلام انتہائی دلکش۔ میں نے ان کی تقریر پہلی مرتبہ سُنی تھی اور ان کے قریب ہی سٹیج پر بیٹھا تھا۔ ہم پاکستانیوں کے نقطۂ نظر سے موضوع بہت نازک تھا اور اس بنا پر اور بھی نازک تھا کہ مقرر مولانا آزاد کے مداح بلکہ معتقد تھے اور ہندوستانی باشندے تھے۔ فاضل مقرر کو داد دینی چاہیے (اور تقریر کے بعد میں نے داد دی) کہ نہ کہیں احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوٹا، نہ کسی موقعے پر فرطِ عقیدت نے زبان کو حدِ اعتدال سے باہر نکلنے دیا اور نہ تقریر کی روانی میں فرق آیا۔ یہ ان کا کمال تھا جس سے سامعین بے حد متاثر ہوئے۔ تقریر ڈیڑھ گھنٹے تک جاری رہی اور لوگوں نے نہایت اطمینان اور دلجمعی سے سُنی۔

انجمن خدام القرآن کے ارباب انتظام نے تو اسے مقرر کی آواز میں ٹیپ کر لیا تھا لیکن میں اس سہولت سے محروم تھا۔ اس لیے جیسے جیسے فاضل مقرر کے الفاظ ان کی زبان سے نکل کر میرے پردۂ سماع سے ٹکراتے جاتے تھے، میں انہیں اپنے خزانۂ ذہن میں محفوظ کرتا جاتا تھا۔ پھر چند روز بعد اسے قلم و قرطاس کی گرفت میں لے آیا تھا۔ ممکن ہے اس میں روایت باللفظ کی زیادہ پابندی نہ رہی ہو کہیں کہیں روایت بالمعنیٰ کی آمیزش بھی ہو گئی ہو، اور ایسا ہونا قدرتی بات ہے۔

لیجیے اب مولانا اکبر آبادی کی تقریر سُنیے۔ انہوں نے مولانا آزاد کے متعدد واقعات بیان کیے۔ میں نے سوانحے پر گول دائرے میں نمبر لگا دیے ہیں۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے تقریر شروع کرتے ہوئے کہا: مولانا ابوالکلام آزاد کے ذکر سے مجھے عزیز لکھنوی کا یہ شعر یاد آ رہا ہے۔

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

① مولانا آزاد کے بارے میں کچھ باتیں تو وہ ہیں جو میرے سامنے ہوئیں اور میں نے ان سے سُنیں اور کچھ وہ ہیں جو

اپنے بزرگوں اور اکابر علما سے معلوم ہوئیں۔ ۱۹۳۶ء میں میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی اور پھر کسی نہ کسی صورت میں یہ سلسلہ ان کی وفات (۲۲ فروری ۱۹۵۸ء) تک جاری رہا۔ وہ انتہا درجے کے جینئس اور نابغہ شخصیت تھے۔ ذہانت و فطانت، حفظ و اتقان اور علم و ادراک میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔ مختلف موضوع کی کتابوں پر انہیں اس قدر عبور و استحضار تھا کہ وہ صحیح معنوں میں چلتا پھرتا کتب خانہ تھے۔ انہوں نے تعلیم کہاں حاصل کی؟ کس عالم سے کیا پڑھا؟ اس کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ نہ خود انہوں نے اس کی وضاحت فرمائی اور نہ کبھی کسی نے ان سے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس کی۔

(۲) اُن کے والد مولوی خیر الدین کلکتہ اور اس کے قرب و جوار کے بہت بڑے پیر اور صاحب طریقت تھے۔ بڑے بڑے لوگ ان کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے، جن میں سیٹھ اور دولت مند لوگ بھی تھے اور قدیم و جدید کے ماہر علما بھی؛ معلوم ہوتا ہے مولوی خیر الدین مرحوم نے انہی میں سے جو جس علم کا ماہر تھا، اسے بیٹے کی تعلیم پر مقرر کر دیا تھا۔

(۳) مولانا کو شروع ہی سے پیری مریدی کے اس انداز سے جو ان کے گھر میں رائج تھا، نفرت تھی اور وہ اس سے بغاوت کا اظہار کرتے تھے۔ والد کی وفات کے بعد انہوں نے اس سلسلے کو ختم کر دیا تھا۔ لیکن چونکہ وہ پیرزادہ اور صاحب زادہ تھے اور ان کا گھر روحانی فیض حاصل کرنے والوں کا مرجع تھا، اس لیے لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ان کے انکار کے باوجود لوگوں نے ان سے اپنے گھر میں یہ سلسلہ جاری رکھنے پر بہت زیادہ اصرار کیا تو انہوں نے فرمایا کہ ہفتے میں دو دن جمعرات اور ہفتے کو آجایا کرو۔ میں درسِ قرآن دیا کروں گا اور مسائل بتایا کروں گا لیکن روپے پیسے یا نذرانہ قبول نہیں کروں گا۔ یہ سلسلہ کچھ عرصہ چلا، پھر بند کر دیا۔

(۴) مولانا بہت زیادہ ذہین، اونچے مرتبے کے عالم اور بلند پایہ مصنف و مقرر تھے۔ اگر اپنے باپ کا سلسلۂ شیخیت جاری رکھتے تو اس میں نہایت کامیاب رہتے۔ مگر یہ ان کی افتادِ طبع کے خلاف تھا۔

(۵) آزادیٔ وطن سے ٹھیک دو ماہ بعد ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو مولانا آزاد نے ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی اور مفتی عتیق الرحمن عثمانی کو لنچ پر بلایا۔ میں ان حضرات سے چھوٹا تھا، مجھے نہیں بلایا گیا تھا، لیکن میں بھی ان کے ساتھ چلا گیا تھا۔ میں اس قسم کی دعوتوں میں ان کے ساتھ منتھی ہو جاتا تھا (یہ الفاظ مولانا اکبر آبادی نے مسکراتے ہوئے فرمائے) کھانے کے بعد مولانا آزاد نے فرمایا کہ میں نے آپ حضرات کو اس لیے تکلیف دی ہے کہ میں دو باتیں کہنا چاہتا ہوں—

ایک یہ کہ ہم قیامِ پاکستان کے مخالف تھے اور ہمارے نزدیک نیک نیتی سے یہ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کے مسائل اور ان کی مشکلات کا صحیح حل نہ تھا۔ لیکن اب پاکستان بن گیا ہے۔ ہمیں پاکستان اور تحریکِ پاکستان کے رہنماؤں کی مخالفت میں ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالنا چاہیے۔ بلکہ نہایت اخلاص کے ساتھ جہاں تک ممکن ہو، پاکستان اور وہاں کے مسلمانوں کی مدد کرنی چاہیے اور دُعا کرنی چاہیے کہ پاکستان قائم اور مستحکم رہے۔ اگر خدانخواستہ پاکستان کو کوئی نقصان پہنچا تو ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے مسلمان کہیں مُنہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔

دوسری بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے نزدیک ہندوستان کے موجودہ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنی کوئی علٰحدہ تنظیم نہیں بنانی چاہیے، برادرانِ وطن کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے زور دے کر کہا: لیکن یہ یاد رکھیے کہ اپنے مذہب اور تہذیب و ثقافت کی حفاظت ہمارا بنیادی مسئلہ ہے۔ مولانا آزاد نے اس موقعے پر دائیں ہاتھ کو حرکت دیتے ہوئے کہا: "اس پر کوئی کمپرومائز نہیں ہو سکتا۔" (مولانا اکبر آبادی نے مولانا آزاد کی زبان سے یہ الفاظ بیان کرتے ہوئے دائیں ہاتھ کو حرکت دی اور کہا: "مولانا نے یوں کیا")

(۶) جب مجھے مدرسہ عالیہ کلکتہ کا پرنسپل بنایا گیا۔ (اس منصب پر ان کو مولانا آزاد نے فائز کیا تھا) تو شیخ الحدیث کی مسند جمعیت علمائے ہند کے مشہور عالم مولانا عبدالحلیم صدیقی کے سپرد ہوئی۔ اس کے لیے ان سے تین سال کا معاہدہ ہوا تھا۔ یہ مدت ختم ہوئی تو میں نے ان کو علحدہ کر دیا۔ مولانا عبدالحلیم صدیقی عربی کے بہت بڑے ادیب تھے، لیکن علم حدیث میں زیادہ مہارت نہیں رکھتے تھے۔ میں علم حدیث کے کسی ماہر عالم کو اس منصب پر لانا چاہتا تھا اور میرے نزدیک مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اس کے لیے زیادہ موزوں تھے۔ اس اثنا میں میں دہلی آیا۔ مولانا کو پتا چلا تو ایک دن اپنے پرائیویٹ سیکرٹری اجمل خاں صاحب سے مجھے ٹیلی فون کرایا کہ میں کل صبح نو بجے پارلیمنٹ ہاؤس میں مولانا سے ملوں۔ میں وہاں پہنچا تو وہ ٹھیک نو بجے تشریف لائے۔ پہلے خیر خیریت پوچھی۔ پھر فرمایا:

"مجھے معلوم ہوا ہے، آپ نے مولوی عبدالحلیم صدیقی کو ملازمت سے الگ کر دیا ہے۔"

میں نے کہا: "جی ہاں — !"

فرمایا: "کیوں ؟"

عرض کیا: "وہ عربی ادبیات اور دیگر علوم میں تو درک رکھتے ہیں، لیکن علم حدیث میں انہیں مہارت حاصل نہیں ہے۔ شیخ الحدیث کا منصب بہت بڑا منصب ہے، میں اس منصب پر کسی ایسے شخص کو لانا چاہتا ہوں جو حدیث کا ماہر ہو۔"

فرمایا: "علم حدیث میں مہارت سے آپ کی کیا مراد ہے ؟"

عرض کیا: "علم حدیث کے بہت سے شعبے ہیں۔ علم رجال، اقسام حدیث، راویوں کے بارے میں معلومات وغیرہ۔"

مولانا نے میری بات سنی تو علم حدیث اور اس کے متعلقات پر تقریر شروع کر دی۔ رمضان کا مہینہ تھا، گرمیوں کے دن تھے اور مولانا روزے سے تھے۔ حدیث، رجال حدیث، روات حدیث، اقسام حدیث، کتب حدیث، شروح حدیث، تدوین حدیث اور ہندوستان میں علم حدیث کی آمد اور ترویج و اشاعت پر دو گھنٹے تقریر کی اور ایسے نکات بیان کیے جو نہ میرے علم میں تھے اور نہ کبھی سنے تھے۔ تقریر ختم ہوئی تو فرمایا: "مولوی عبدالحلیم کو اپنی جگہ پر رہنے دیجیے۔ اب آپ کو کوئی انور شاہ تو ملے گا نہیں، انہی کو شیخ الحدیث ماننا اور انہی سے کام لینا ہوگا۔"

میں اجازت لے کر آنے لگا تو فرمایا: "میری بات آپ کو یاد رہے گی ؟"

میں نے کہا: "صاحب ! کیا میں آپ کا فرمان بھول کر آپ سے دشمنی کروں گا۔"

پھر دو دفعہ فرمایا: "اللہ آپ کو جزائے خیر دے ! اللہ آپ کو جزائے خیر دے !!"

(۷) مولانا اکبر آبادی نے مولانا آزاد کی بے پناہ ذہانت اور کتابوں پر عبور و استحضار کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ۱۹۲۱ء میں مجلس خلافت کی جو کانفرنس آگرہ میں مولانا آزاد کے زیر صدارت ہوئی تھی، میں اس میں شریک نہیں تھا۔ مولانا نے اس میں "خلافت اور جزیرۃ العرب" کے موضوع پر زبانی خطبہ دیا تھا جو چھپ چکا ہے۔ وہ خطبہ اس قدر عالمانہ اور محققانہ تھا کہ جو علمائے کرام اس میں موجود تھے، وہ مولانا کے خطبے سے انتہائی حیران اور متعجب تھے کہ یہ شخص کس قدر روانی سے عربی کی عبارتوں کی عبارتیں پڑھ رہا ہے اور باقاعدہ کتابوں کے حوالے دے رہا ہے۔

(۸) مولانا آزاد، امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم سے بہت متاثر تھے اور ان کی تمام کتابیں مولانا کے کتب خانے میں موجود تھیں۔ مولانا کی وفات کے بعد حکومت ہند نے آزاد بھون کے نام سے جو ادارہ قائم کیا ہے، مولانا کا کتب خانہ اس میں منتقل ہو گیا ہے۔ اس میں ہر موضوع کی کتابیں موجود ہیں۔ ان سے پتا چلتا ہے کہ مولانا نے ان کتابوں کا مطالعہ کیا تھا، ان پر جا بجا ان کے حواشی ہیں۔ حکومت ہند نے ایک محکمہ قائم کر کے ایک صاحب علم کو اس کام پر مقرر کیا ہے کہ وہ مولانا کے حواشی

جمع کریں۔ یہ کام ہو رہا ہے۔

(۹) مولانا نہایت خوددار تھے اور وقار سے زندگی بسر کرتے تھے۔ ان پر انتہائی مالی پریشانی کا دور بھی آیا لیکن وہ اس کا کسی سے اظہار نہ کرتے تھے۔ جس زمانے میں وہ تفسیر ترجمان القرآن کی پہلی جلد لکھ رہے تھے اس زمانے میں ان کے کاتب منشی عبدالقیوم تھے جو کانپور کے رہنے والے تھے اور چھ سات مہینے تفسیر کی کتابت کے سلسلے میں مولانا کے پاس رہے تھے۔ اس کے بعد وہ ہمارے پاس "برہان" میں آگئے تھے اور اس کی کتابت کرتے تھے۔ وہ ان کی زندگی کے عجیب و غریب واقعات سنایا کرتے تھے۔ مثلاً منشی عبدالقیوم نے بتایا کہ مولانا کلکتے کے علاقہ بالی گنج میں ایک دو منزلہ کوٹھی میں رہتے تھے اور اس کا پانچ سو روپے ماہانہ کرایہ تھا۔ مولانا کی مالی حالت اس زمانے میں اتنی کمزور تھی کہ انہیں مجبوراً کوٹھی کا نیچے کا حصہ کرائے پر دینا پڑا۔ اس دور میں ان پر ایسا وقت بھی آیا کہ غربت کی وجہ سے ان کا چولہا نہ جلتا تھا۔ ان کے ملازم کا نام احمد تھا۔ وہ احمد کو ایک چونی دیتے اور آہستہ سے کہتے، "دو روٹیاں اور دال لے آؤ۔ مولانا اور ان کی بیوی ایک ایک روٹی دال کے ساتھ کھا کر گزارہ کرتے تھے۔

اسی دوران ایک دن مولانا سے ملاقات کے لیے گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو ان کے گھر آئے۔ مولانا کا ایک ہی جوڑا تھا جو وہ پہنتے تھے۔ کھدر کی قمیص مونڈھے سے پھٹی ہوئی تھی۔ مولانا کو ان کی آمد کی اطلاع ہوئی تو پھٹی ہوئی قمیص کو چھپانے کے لیے اوپر چادر اوڑھ لی۔ اسی حالت میں بیٹھے ان سے باتیں کرتے رہے۔ انہیں معلوم تھا کہ مولانا تنگ دستی کے عالم میں ہیں۔ انہوں نے اس کا کچھ اشارہ کیا تو فرمایا، "نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

(۱۰) مولانا کسی کے خلاف کوئی بات نہ کہتے تھے۔ ان کا ایک خاص موقف تھا جس کا وہ کھل کر اظہار کرتے تھے۔ لیکن کسی کی مخالفت کرنا یا کسی کے بارے میں حرفِ شکایت زبان پر لانا وہ جانتے ہی نہ تھے۔ (مولانا اکبر آبادی نے بتایا) قلعہ احمد نگر سے رہائی سے کچھ عرصہ بعد وہ دہلی سے الٰہ آباد جا رہے تھے۔ ان کی ٹرین علی گڑھ پہنچی تو مسلم یونیورسٹی کے طلبا نے ریلوے اسٹیشن پر ان کے خلاف زبردست مظاہرہ کیا اور نہایت نازیبا حرکات کیں۔ جواہر لال کو پتا چلا تو وہ الٰہ آباد میں ان کی قیام گاہ پر آئے اور اس حادثے پر اظہارِ افسوس کیا۔ مولانا نے مسکرا کر فرمایا، یہ کوئی افسوس کی بات نہیں ہے۔ طلبا ہمارے بچے ہیں اور بچے والدین سے کچھ کہیں تو انہیں اس کا حق پہنچتا ہے۔ آئندہ ہمیں انہی سے کام لینا ہے، ان کی باتیں سننی اور برداشت کرنی چاہئیں۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے جب یہ واقعہ بیان کیا تو ایک بات مجھے بھی یاد آئی۔ کئی سال ہوئے ہندوستان کے ایک صاحب جو مسلمان تھے، لاہور آئے اور ہمارے دفتر ادارہ ثقافت اسلامیہ بھی تشریف لائے۔ مجھ سے ان کی ملاقات ہوئی تو ادھر اُدھر کی چند باتوں کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں گفتگو ہونے لگی۔ وہ ہندوستان کے محکمہ تعلیم میں اچھے خاصے منصب پر فائز تھے۔ انہوں نے بتایا کہ آزادی سے کچھ عرصہ بعد وہ محکمہ تعلیم میں ملازم ہوئے۔ ایک دن کسی محکمانہ کام کے سلسلے میں مولانا آزاد کی خدمت میں گئے۔ مولانا وزیر تعلیم تھے۔ محکمے کے چند افسر وہاں موجود تھے۔ مولانا نے میری طرف دیکھا تو فرمایا، "آپ کو کہیں دیکھا ہے۔" ان کی زبان سے یہ الفاظ سنتے ہی مجھے پسینے چھوٹنے لگے۔ اس لیے کہ علی گڑھ ریلوے اسٹیشن پر جن طلبا نے مولانا کے خلاف مظاہرہ کیا تھا، میں ان میں پیش پیش تھا اور اب کئی سال بعد ان کے ماتحت تھا اور انہوں نے مجھے پہچان لیا تھا۔ لیکن یہ بات مولانا نے یہیں ختم کر دی اور میرے ساتھ ہمیشہ شفقت کا برتاؤ کرتے رہے۔

(۱۱) مولانا اکبر آبادی نے فرمایا کہ آزادی کے بعد مولانا آزاد نے ہندوستان کے تعلیمی، ثقافتی، تہذیبی اور تصنیفی اداروں کی حفاظت کے لیے بھرپور کوششیں کیں اور حکومت کی طرف سے انہیں گراں قدر مالی امداد دلائی۔ مثلاً دائرۃ المعارف حیدر آباد

(دکن) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، دارالمصنفین اعظم گڑھ، مدرسہ عالیہ کلکتہ اور بعض دیگر اداروں کا جو ہندوستان کے مسلمانوں کے علمی اور ثقافتی مراکز ہیں، حفظ و بقا مولانا آزاد ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ مولانا نے ان کے لیے لاکھوں روپے کی ماہانہ اور سالانہ امداد منظور کرائی جو ان اداروں کو باقاعدہ حکومتِ ہند کی طرف سے مل رہی ہے۔

(۱۲) مولانا آزاد سے شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے تعلقِ خاطر کے بارے میں مولانا اکبر آبادی نے بتایا کہ شیخ الہند ان کے بہت مدّاح تھے اور ان کی تحریریں ذوق و شوق سے سُنتے اور پڑھتے تھے۔ وہ "الہلال" کے منتظر رہتے، جونہی الہلال آتا پڑھنا یا سُننا شروع کر دیتے اور اوّل سے آخر تک تمام مضامین کا مطالعہ کرتے۔

(۱۳) مسجد کانپور کے سلسلے میں مولانا آزاد نے الہلال میں مدلّل اور زوردار مقالے لکھے تھے، جن سے انگریزی حکومت کے خلاف ہندوستان کے مسلمانوں کے دلوں میں ایک خاص جوش اور جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ انہی دنوں یوپی کا انگریز گورنر سر جیمس مسٹن دارالعلوم دیوبند گیا۔ مولانا آزاد بھی وہاں پہنچ گئے، لیکن مولانا کو دروازے پر روک دیا گیا، دارالعلوم کے احاطے میں داخل نہیں ہونے دیا گیا۔ گورنر دارالعلوم کے اندر وہاں کے علماء اور اصحابِ انتظام سے گفتگو کر رہا تھا اور مولانا باہر کھڑے تھے۔

شیخ الہند ان دنوں بیمار تھے اور گھر میں تھے۔ وہ دارالعلوم میں گورنر کی آمد کے خلاف تھے۔ انہیں مولانا آزاد کی تشریف آوری کا پتا چلا تو آدمی بھیج کر مولانا کو گھر پر بلایا۔ نہایت احترام سے پیش آئے اور فرمایا میں نہیں چاہتا تھا کہ گورنر کو دارالعلوم میں آنے کی دعوت دی جائے۔ یہ میری مرضی کے خلاف ہوا ہے۔ انہوں نے مولانا کو دُعا دی اور ان کی تعریف کی۔ فرمایا مجھے افسوس ہوا آپ کو دارالعلوم میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی گئی۔

دورانِ گفتگو میں مولانا آزاد نے شیخ الہند سے پوچھا: آپ میری اور الہلال کی اتنی تعریف کیوں کرتے ہیں؟ فرمایا اس لیے کہ آپ نے ہمیں بھولا ہوا سبق یاد دلایا ہے اور الہلال میں جرأت مندی کے ساتھ وہ موقف اختیار کیا ہے جو اور کوئی نہیں کر سکتا تھا۔

(۱۴) مولانا اکبر آبادی نے مولانا آزاد کی بیعت اور ان کو امام الہند بنانے کا واقعہ بھی بیان کیا۔ انہوں نے کہا کہ ہندوستان کے اکثر علما جن میں اہلِ حدیث اور دیوبندی حضرات شامل تھے، مولانا کے ہاتھ پر بیعت کرنا اور انہیں امام الہند بنانا چاہتے تھے۔ لیکن دیوبند کے مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی اور ہمارے استاد مولانا انور اس کے مخالف تھے۔ ان کے نزدیک اختلاف کی چند وجوہ تھیں۔

ایک یہ کہ مولانا آزاد اگرچہ بہت بڑے عالم، ذہین اور تحریر و تقریر میں بے مثال ہیں، لیکن کسی دارالعلوم کے باقاعدہ سند یافتہ نہیں ہیں۔

دوسری یہ کہ نوجوان ہیں اور ان کے مقابلے میں بہت سے بزرگ علماء اس ملک میں موجود ہیں۔

تیسری یہ کہ مولانا علم و فضل کے باوجود اتقا اور پرہیزگاری میں اس مقام پر نہیں ہیں جس کا یہ منصب تقاضا کرتا ہے۔

چوتھی وجہ وہ حضرات یہ بیان کرتے تھے کہ جن امور کے نفاذ کے لیے بیعت کرنے اور امام الہند بنانے کا منصوبہ بنایا گیا ہے، انہیں اس ملک میں نافذ کون کرے گا؟ اس کے لیے قوتِ تنفیذیہ کا پایا جانا ضروری ہے جو موجودہ دورِ غلامی میں ممکن نہیں۔

(۱۵) مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے کہا کہ مولانا آزاد کسی مسئلے کو زیرِ بحث لاتے تو اس کے تمام گوشوں کی وضاحت کرتے اور اپنے موقف کی تائید میں ایسے ایسے دلائل بیان فرماتے کہ کوئی اس کا جواب نہ دے سکتا تھا۔ انہوں نے مولانا محمد میاں مراد آبادی کے حوالے سے بتایا کہ جوش ملیح آبادی اور مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی کا مولانا آزاد کے ہاں بہت آنا جانا

تھا۔ جوش خدا کو نہیں مانتے تھے (اور بقول مولانا اکبر آبادی کے) "عبدالرزاق ملیح آبادی بھی اس سلسلے میں ان سے کم درجے کے نہ تھے۔" ایک دن یہ دونوں مولانا آزاد کے مکان پر ان کے پاس بیٹھے تھے کہ مولانا نے ان سے کہا: میرا آپ سے بہت عرصے سے تعلق ہے۔ میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتا تھا جو اب تک نہیں کہی۔ یہ زندگی کا آخری دور ہے۔ میں چاہتا ہوں، اب یہ فرض ادا کر دوں۔

انہوں نے پوچھا: ایسی کون سی بات ہے؟

فرمایا: میں خدا کے وجود کے بارے میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں، کل دس بجے یہاں آ جائیے۔

مولانا عبدالرزاق نے اسی شام یہ بات مسجد فتح پوری میں بعض لوگوں کو بتا دی جن میں مولانا محمد میاں مراد آبادی بھی تھے۔ ان حضرات نے مولانا سے ٹیلی فون پر بالطبع قائم کیا اور پوچھا کہ ہم لوگوں کو بھی اس مجلس میں آنے کی اجازت ہے؟ مولانا نے فرمایا: ہاں آپ بھی آ جایئے، اور بھی جو لوگ آنا چاہیں آ جائیں — چنانچہ دوسرے دن وقتِ مقررہ پر مولوی عبدالرزاق، جوش ملیح آبادی اور مولانا محمد میاں (مولانا اکبر آبادی نے بعض اور حضرات کے نام بھی لیے جو مجھے یاد نہیں رہے) مولانا کے مکان پر پہنچ گئے۔

مولانا اکبر آبادی نے کہا کہ مجھے مولانا محمد میاں نے بتایا کہ مولانا آزاد نے تقریر شروع کی اور وجودِ باری پر تمام دلائل قرآن سے دیے لیکن نہ کہیں قرآن کا نام لیا، نہ کوئی آیت پڑھی اور نہ کسی حدیث کا حوالہ دیا۔ تمام دلائل اس طرح عقلی انداز میں پیش کیے کہ دل میں اترتے اور اپنی جگہ بناتے جاتے تھے۔ ہم مولانا کے اثر آفرین اسلوبِ کلام اور طرزِ بیان پر حیران تھے۔ اس قسم کی باتیں نہ ہمیں سوجھی تھیں اور نہ کبھی سنی تھیں۔ مولانا تقریر ختم کر چکے تو فرمایا: میرے بھائی — : میں اپنا فرض ادا کر چکا۔ اب کچھ کہنا چاہتے ہو تو کہو — :

مولوی عبدالرزاق نے کہا: مولانا — : میں آپ کے سامنے توبہ کرتا ہوں اور اقرار کرتا ہوں کہ میرا پہلا نقطۂ نظر غلط تھا۔ میں اللہ کو مانتا ہوں اور اپنے پچھلے گناہوں کی اللہ سے معافی مانگتا ہوں۔

جوش ملیح آبادی نے کہا: مولانا: میں آپ کے دلائل کا جواب تو نہیں دے سکتا لیکن میرا دل نہیں مانتا کہ خدا ہے۔

یہ تو تھی مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی روایت جو انہوں نے مولانا محمد میاں مراد آبادی کے حوالے سے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے بارے میں بیان کی — لیکن بہت عرصہ ہوا میں نے کہیں اس ضمن میں جو واقعہ پڑھا تھا اس میں مولانا عبدالرزاق کا نام نہیں تھا۔ جوش ملیح آبادی کا نام بھی نہیں تھا۔ صرف یہ الفاظ مرقوم تھے کہ ایک مشہور شاعر سے مولانا نے کہا کہ میں آپ سے خدا کے وجود کے بارے میں بات کروں گا — یہ الفاظ بھی نہیں تھے کہ جوش نے مولانا سے کہا کہ میں آپ کے دلائل کا جواب تو نہیں دے سکتا، لیکن میرا دل نہیں مانتا کہ خدا ہے — تاہم "مشہور شاعر" سے مراد جوش ملیح آبادی ہیں۔

اب مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے بارے میں سنیئے۔ ان کا شمار مولانا آزاد کے قدیم رفقا اور معتقدین میں ہوتا ہے۔ کلکتے میں مولانا نے جو مدرسہ قائم کیا تھا، اس کا منتظم انہی کو بنایا گیا تھا۔ عربی کے آدمی تھے اور بہت باخبر عالم تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف اور مترجم تھے۔ امام ابن عبدالبر کی مشہور عربی کتاب "العلم والعلماء" کا ترجمہ بھی انہوں نے کیا اور امام ابن تیمیہ کی بھی بعض کتابوں کو اردو کے قالب میں ڈھالا۔ ۱۹۲۳ء میں مولانا آزاد نے کلکتے سے "الجامعہ" کے نام سے جو ہفت روزہ عربی رسالہ جاری کیا تھا اس کے ایڈیٹر یہی عبدالرزاق ملیح آبادی تھے۔ آزادی کے بعد مولانا آزاد نے وزارتِ تعلیم کی طرف سے "ثقافۃ الہند" کے نام سے عربی میں جو ماہانہ رسالہ دہلی سے جاری کیا تھا، اس کے ایڈیٹر بھی یہی تھے۔ اب اس رسالے کے

ایڈیٹر ڈاکٹر نثار احمد فاروقی ہیں جو دہلی یونیورسٹی میں شعبۂ عربی کے چیئرمین ہیں اور میرے مخلص دوستوں میں سے ہیں۔ مولانا آزاد کی وفات کے بعد مولانا عبدالرزاق نے مولانا کے حالات میں دو تین کتابیں بھی لکھیں۔

میرے خیال میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے نام سے متعلق مولانا سعید احمد اکبرآبادی یا مولانا محمد میاں کو سہو ہو گیا ہے منکرِ خدا وہ نہیں تھے، کوئی اور صاحب ہوں گے۔

(۱۶) مولانا اکبرآبادی نے تقریر کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ پنڈت سندر داس نے مجھے بتایا کہ گاندھی جی نے ایک مرتبہ ان سے کہا کہ مولانا آزاد بہت بڑے عالم و فاضل ہیں اور ہمیں ان پر فخر ہے۔ ہم ان کے مشوروں کے محتاج رہتے ہیں۔ ملکی معاملات میں ان کی رائے کو آخری رائے سمجھا جاتا ہے اور کانگریس کے اکثر فیصلے مولانا آزاد کی رائے کے مطابق ہوتے ہیں۔ لیکن میں نے دیکھا کہ ان میں روحانیت نہیں ہے۔ اس کے برعکس مولوی حسین احمد مجھے ملتے ہیں تو میں ان میں ایک روحانی کشش محسوس کرتا ہوں (مولانا اکبرآبادی نے "مولوی حسین احمد" کہا تھا۔)

پنڈت سندر داس کی یہ بات بیان کرنے کے بعد مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے کہا کہ مولانا آزاد کا ظاہر اور باطن ایک تھا انہوں نے کبھی اپنے آپ کو چھپایا نہیں۔ مثلاً وہ سگریٹ پیتے تھے تو سب کے سامنے پیتے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ لوگوں کے جانے کے بعد یا ادھر ادھر چھپ چھپا کر پیئیں (مولانا اکبرآبادی نے یہ الفاظ اس انداز سے کہے کہ سامعین کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ خود مقرر بھی مسکرائے)

مولانا اکبرآبادی نے فرمایا: یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے، اُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ان میں کوئی بُرائیاں ہوں تو اللہ ان کی برائیوں کو نیکیوں میں بدل دیتا ہے۔

(۱۷) مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے پنڈت جواہر لال نہرو کے سابق سیکرٹری متھائی کی کتاب کا ذکر بھی کیا۔ انہوں نے کہا متھائی نے اس کتاب میں مولانا آزاد پر بعض الزامات عائد کیے تھے۔ متھائی گھٹیا ذہنیت کا مالک تھا اور محکمانہ اعتبار سے بہت بُری شہرت رکھتا تھا۔ اس کی کتاب شائع ہوئی تو ہندوستان کے سنجیدہ ذہن کے لوگوں نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی اور اس کے مندرجات کو قابلِ اعتنا نہیں گردانا۔ مولانا کے سیاسی مخالفوں نے بھی اسے لائقِ توجہ قرار نہیں دیا۔ تاہم بعض حضرات نے اس کا جواب دیا اور مولانا کے دفاع کے ساتھ ساتھ خود متھائی کے ذاتی کردار کی وضاحت کی اور اس کی فطرت کا تجزیہ کیا۔ جواب دینے والوں میں ہندو بھی شامل ہیں اور مسلمان بھی۔

مولانا اکبرآبادی نے کہا مجھے پتا چلا ہے کہ پاکستان کے بعض اصحاب متھائی کی کتاب سے متاثر ہوئے اور اس کے اس حصے کو خوب اچھالا، جس کا تعلق مولانا آزاد سے تھا۔ میرے خیال میں وہ لوگ خود متھائی کے عمل و کردار سے واقف نہیں ہیں اگر انہیں اس سے تھوڑی بہت واقفیت حاصل ہوتی تو اسے قطعاً قابلِ التفات نہ ٹھہراتے۔ غالباً وہ مولانا کی ان خدمات سے بھی آگاہ نہیں ہیں جو انہوں نے آزادی کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے سرانجام دیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہندوستان کے متعدد مشہور تعلیمی اور تصنیفی ادارے محض مولانا آزاد کی کوششوں سے محفوظ رہے۔

مولانا اکبرآبادی کی تقریر ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہی اور لوگوں نے نہایت اطمینان و سکون سے سُنی۔ ان کی یہ پہلی اور آخری پبلک تقریر تھی جو مجھے سننے کا موقع ملا اور جس سے میں انتہائی محظوظ اور متاثر ہوا۔

مولانا اکبرآبادی نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پورے برصغیر میں علمی اعتبار سے اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ تصنیف و تالیف اور تعلیم و تدریس میں ان کو خاص شہرت حاصل تھی اور اس سلسلے میں ان کا تجربہ بہت وسیع تھا۔ قدیم و جدید پر ان کی نظر تھی، بلکہ کہنا چاہیے کہ اس دور میں وہ قدیم و جدید کا سنگم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی سے کچھ عرصہ بعد مولانا ابوالکلام آزاد نے ان کو

مدرسہ عالیہ کلکتہ کا پرنسپل مقرر کر دیا تھا اور یہ خدمت انہوں نے حسن و خوبی کے ساتھ انجام دی۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں وہ کئی سال شعبۂ دینیات کے استاد رہے۔ بعض دیگر تعلیمی اداروں کے ارباب انتظام نے بھی ان کو اس ذمہ دارانہ منصب پر فائز کیا اور وہ ان کی توقعات پر پورا اترے۔ اپنے ملک (ہندوستان) سے باہر کی بعض یونیورسٹیوں کے اصحاب بست و کشاد نے بھی تعلیم و تدریس کے لیے ان کی خدمات حاصل کیں اور وہاں کے علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔

آزادی سے کچھ عرصہ قبل وہ دہلی کے سینٹ سٹیفنس کالج میں پڑھاتے تھے۔ اس زمانے میں صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق بھی اس کالج میں تعلیم حاصل کرتے تھے اور ان کے حلقۂ شاگردی میں شامل تھے۔ مولانا اکبر آبادی نے ایک مرتبہ خود اس کا ذکر کیا اور فرمایا کہ جب جنرل ضیاء الحق پاکستان کے صدر بنے تو دہلی کے بعض حضرات نے ان سے کہا کہ یہ آپ کے شاگرد ہیں۔ اسلام آباد میں ان کی صدر سے ملاقات ہوئی تو صدر نے کہا آپ کی عمر تو بے شک بڑھ گئی ہے۔ لیکن چہرے کے خدوخال وہی ہیں۔

تصنیف و تالیف اور نشر و اشاعت کے لیے تین اصحاب علم نے دہلی کے قرول باغ میں "ندوۃ المصنفین" کے نام سے ۱۹۳۸ء میں ایک ادارہ قائم کیا تھا اور اس کی طرف سے ایک ماہنامہ رسالہ "برہان" جاری کیا گیا تھا جس کے فرائض ادارت مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے سپرد ہوئے تھے۔ ان اصحاب ثلاثہ کے اسمائے گرامی ہیں: مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی۔

۱۹۴۷ء میں جب دہلی پر خون کی گھٹا چھائی اور قتل و غارت اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہوا تو قرول باغ کا علاقہ بھی اس کی زد میں آگیا اور ندوۃ المصنفین کی مطبوعات، کتب خانہ، عمارت اور تمام سامان فسادی عناصر نے نذر آتش کر دیا۔ اس کے بعد حالات میں کچھ تبدیلی آئی تو ندوۃ المصنفین کے بانیوں نے دہلی کی جامع مسجد کے قریب اردو بازار میں از سر نو کام کا آغاز کیا اور محنت و سعی سے اس تصنیفی و اشاعتی ادارے کو نئی زندگی سے روشناس کرایا اور کام کی رفتار کو آگے بڑھایا۔

بلاشبہ یہ تینوں بزرگ میدان علم و تحقیق کے شہسوار تھے اور انہوں نے انتہائی نامساعد حالات میں بے حد لگن اور کوشش سے اس سلسلے کو جاری رکھا۔ ان میں سے مولانا حفظ الرحمٰن ۲ اگست ۱۹۶۲ء کو عازم فردوس ہوئے، مفتی عتیق الرحمٰن نے ۱۲ مئی ۱۹۸۴ء کو سفر آخرت اختیار کیا اور اس سے ٹھیک ایک سال بارہ دن بعد ۲۴ مئی ۱۹۸۵ء کو مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے بہشت بریں کو اپنا ٹھکانہ بنایا۔ نہایت افسوس ہے ہم ان کی وفات سے تقریباً سوا تین سال بعد ندوۃ المصنفین کے بانیوں کی آخری نشانی مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی صف ماتم بچھا رہے ہیں۔

وہ صاحب نظر مصنف اور منجھے ہوئے مقالہ نگار تھے۔ سوچ سمجھ کر قلم اٹھاتے اور پھر عمدہ اسلوب سے صفحات قرطاس کو اپنے افکار و تصورات سے مزین کرتے جاتے۔ ان کی تصنیفات ان کی اصابت فکر کی آئینہ دار اور تحقیق و کاوش کی غماز ہیں۔ "برہان" میں ان کے مطبوعہ مقالات ان کے علم و ادراک اور دقت نظر کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کی تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ فہم قرآن سے : اس کتاب کا ایک حصہ قرآن سے متعلق اور ایک حصہ حدیث رسولؐ کی جمع و تدوین کے بارے میں ہے۔ چالیس برس سے زائد عرصہ ہوا کہ سب سے پہلے میں نے ان کی یہی کتاب پڑھی تھی، جس کا نقش تازہ اب تک لوح قلب پر مرتسم ہے۔

۲۔ وحی الٰہی : اپنے موضوع کی بہت اچھی کتاب ہے۔

۳۔ اسلام میں غلامی کی حقیقت : غلامی ایک اہم مسئلہ ہے اور شریعت اسلامی نے غلام کو جو حقوق عطا کیے ہیں اور غلامی کا سسٹم ختم کرنے کے لیے جو اقدامات کیے ہیں، اس کتاب میں اسے تفصیل سے

بیان کیا گیا ہے۔

۴ — غلامانِ اسلام : اس میں ان غلاموں کا تذکرہ کیا گیا ہے جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شرفِ صحبت حاصل تھا یا جو تابعین کی وسعت پذیر فہرست میں شامل تھے۔

۵ — صدیقِ اکبر : یہ کتاب خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حالات و سوانح پر مشتمل ہے۔

۶ — عثمان ذوالنورین : اس میں خلیفۂ ثالث حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی حیاتِ طیبہ تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔

۷ — مسلمانوں کا عروج و زوال : اپنے موضوع سے متعلق یہ لائقِ مطالعہ کتاب ہے۔

۸ — خطباتِ اقبال پر ایک نظر : اس میں علامہ اقبال کے خطبات کا دینی نقطۂ نگاہ سے جائزہ لیا گیا ہے۔

۹ — نفثۃ المصدور اور ہندوستان کے شرعی حیثیت : یہ کتاب ان کے دو مقالوں پر مشتمل ہے، جو "برہان" میں شائع ہوئے تھے اور بعد کو انہیں کتابی شکل دے دی گئی۔ اس میں اس مسئلے پر مفصل بحث کی گئی ہے کہ ہندوستان کی شرعی حیثیت کیا ہے۔ مولانا ممدوح نے لکھا ہے کہ ہندوستان نہ دارالکفر ہے، نہ دارالحرب ہے اور نہ دارالامن ہے۔ یہ دارالقوم ہے، جس میں مختلف مذاہب کی بہت سی قومیں آباد ہیں۔

۱۰ — چار علمی مقالات : یہ "برہان" میں ان کے شائع شدہ چار علمی و تحقیقی مقالات کا مجموعہ ہے۔

ہندوستان کے سیاسی معاملات کو مولانا اکبر آبادی اپنے رسالے "برہان" میں کھل کر زیرِ بحث لاتے اور بغیر کسی جھجک اور رورعایت کے ان پر اظہارِ رائے کرتے تھے۔ جن مسائل و معاملات کا تعلق وہاں کے مسلمانوں سے ہوتا، ان کے بارے میں ان کا قلم بالخصوص جوش میں آجاتا تھا۔ اس کے لیے "برہان" کے اداریے دیکھے جا سکتے ہیں۔ وہ اس کی شہادت دیں گے۔

وہ ہندوستان کی بزمِ علم کے ممتاز رکن، دبستانِ دیوبند کے لائقِ احترام بزرگ، دارالعلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ کے ممبر اور شیخ الہند اکیڈیمی کے صدر تھے اور صدر کی حیثیت سے دیوبند کے مجمعِ علما میں ان کا دفتر تھا۔ علی گڑھ میں گھر تھا اور ان کے اہل و عیال وہیں مقیم ہیں۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے وہ سالہا سال منسلک رہے تھے اور وفات سے کچھ عرصہ پہلے علی گڑھ میں اقامت گزیں تھے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ حضرت مولانا انور شاہ صاحب کاشمیری کے فیض یافتہ اور اس دور کے عالی مرتبت اساتذہ کے آخری تلامذہ میں سے تھے۔ اب غالباً مولانا انور شاہ کے چند ایک شاگرد اس دنیائے فانی میں موجود ہیں اور وہ ہیں گوجرانوالہ کے مولانا محمد چراغ صاحب — !

مولانا سعید احمد کئی مہینوں سے بیمار تھے۔ مئی ۱۹۸۴ء میں مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کا انتقال ہوا، اس سے بھی وہ متاثر تھے۔ اس سے دو ماہ بعد ان کے بڑے بیٹے عمر سعید اچانک وفات پا گئے تھے۔ اس المیہ سے بھی وہ بہت مغموم تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ عمر سعید کی وفات کے دن انہوں نے کسی معاملے میں بیٹے کو سخت ڈانٹ پلائی تھی۔ عمر سعید نیند آور گولیاں کھا کر سونے کے عادی تھے، باپ کے ذہن میں یہ بات سما گئی تھی کہ ان کی ڈانٹ سے دل برداشتہ ہو کر بیٹے نے مقررہ مقدار سے زیادہ گولیاں کھالیں، جس کی وجہ سے اس کی موت واقع ہو گئی۔ اس اعتبار سے وہ اپنے آپ کو بیٹے کی موت کا باعث قرار دینے لگے تھے۔

بیٹے کی وفات سے کچھ عرصہ بعد اگست ۱۹۸۴ء میں ان کو علی گڑھ میں کتے نے کاٹ لیا تھا۔ ڈاکٹروں نے ان کے پیٹ میں ٹیکے لگائے۔ چند روز بعد وہ جگہ جہاں ٹیکے لگائے گئے تھے، متورم ہو گئی اور انہیں بخار آنے لگا۔ ڈاکٹروں کی تشخیص کے مطابق وہ ملیریا بخار تھا اور انہیں کونین کی گولیاں کھلانا شروع کر دی گئیں۔ کونین کے زیادہ استعمال نے ان کے جگر کو متاثر کیا اور غالباً

پیدا ہونا بند ہوگیا۔ جگر کی خرابی نے یرقان کی شکل اختیار کرلی اور انہیں بغرض علاج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ہسپتال میں داخل کرادیا گیا۔ ڈاکٹروں نے بہت توجہ سے علاج کیا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔ ان کی صاحبزادی کو جو (کراچی رہتی ہیں) باپ کی بیماری کا پتا چلا تو علی گڑھ پہنچیں اور بہتر علاج کے لیے انہیں کراچی لے آئیں۔ معالجوں سے رجوع کیا گیا تو معلوم ہوا مثانے میں پتھری پیدا ہوگئی ہے اور پیٹ میں، جہاں ٹیکے لگائے گئے تھے، سرطان نمودار ہوگیا ہے۔ ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق اس کا علاج آپریشن تھا۔ لیکن کمزوری اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ وہ آپریشن کے متحمل نہ ہوسکتے تھے۔

مولانا اکبرآبادی جس طرح تندرستی کے عالم میں خوش وخرم رہتے تھے۔ پتا چلا ہے کہ حالت مرض میں بھی اسی طرح ہشاش بشاش رہتے تھے۔ نماز بروقت ادا کرتے تھے، تھوڑا بہت مطالعے کا سلسلہ بھی جاری رہتا اور کراچی کے جو اہل علم ملاقات اور عیادت کو کو آتے، ان سے بھی بات چیت ہوتی، جس میں بعض اوقات طوالت بھی آجاتی۔ بالآخر موت کا وقت آگیا۔ ۴ رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ (۲۴ مئی ۱۹۸۵ء) کو افطار سے تھوڑی دیر پہلے وہ غسل خانے سے وضو کرکے اپنے کمرے کو جارہے تھے کہ چلتے چلتے حرکتِ قلب بند ہوگئی اور پل بھر میں ان کی زندگی کا خاتمہ ہوگیا۔ انہوں نے کراچی میں وفات پائی اور اسی شہر کی سرزمین میں مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی مرحوم کے دارالعلوم (کورنگی) کے احاطۂ قبرستان میں، مفتی صاحب کے مرقد کے قریب دفن کیے گئے۔ اللھم اغفر لہ وارحمہ۔

مولانا سعید احمد اکبرآبادی ۱۹۰۸ء کو آگرہ (یوپی) میں پیدا ہوئے تھے۔ اس حساب سے وہ اگرچہ عمر طبعی کو پہنچ گئے تھے اور کم وبیش زندگی کی ستتر بہاریں دیکھ چکے تھے، لیکن ان کا شمار ہمارے نزدیک اُن شخصیتوں میں ہوتا تھا جن کے بارے میں موت کی الم ناک خبر سننے کو جی نہیں چاہتا۔ وہ بے شک عمر کی کسی منزل میں داخل ہوجائیں، خیال یہی رہتا ہے کہ ابھی اس دُنیا میں ان کی ضرورت ہے اور ان کا دائرۂ فیض رسانی اور وسیع ہونا چاہیے اور لوگوں کو ان سے مستفید ہونے کے مزید مواقع میسّر آنے چاہئیں ــــ لیکن یہ ہماری ایسی خواہش ہے جو کبھی پوری نہیں ہوسکتی۔ موت کا سایہ ہر شخص پر ہر آن منڈلا رہا ہے، کسی کو اس سے مفر نہیں۔ ہر متنفس چھوٹا ہو یا بڑا، عالم ہو یا جاہل، نبی ہو یا ولی، غوث ہو یا قطب، سب کے درِحیات پر بالآخر فرشتۂ اَجل عزرائیل آدستک دیتا ہے اور اپنی اپنی باری پر ہر ذی روح کو موت کی وادی میں دھکیلتا جاتا ہے۔ کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَۃُ الْمَوْتِ۔

یہاں ہیر وارث شاہ کے دو شعر یاد آرہے ہیں۔ رانجھا جب جوگی بن کر ہیر سے ملاقات کے لیے رنگ پور کھیڑیاں گیا اور بھیک مانگتے مانگتے ہیر کے دروازے پر پہنچا تو سہتی کے ہاتھوں اس کا ٹھوٹھا (کاسۂ گدائی) ٹوٹ گیا۔ جوگی نے اس پر خفگی کا اظہار کیا تو وارث شاہ کی زبان میں سہتی نے اس سے کہا:

جو جمیاں مرے گا سبھ کوئی گھڑیا بھج سی واہ سب وہن گے وے
میر، پیر، ولی، غوث، قطب جاسن ایہ سبھ لپارڈے ڈھین گے وے
جدوں رب اعمال دی خبر پچھے ہتھ پیر گواہیاں کہن گے وے
جدوں عمر دی اودھ میعاد پگی عزرائیل ہوری آ بہن گے وے

ان دُو شعروں میں دردناک انداز میں موت کی حقیقت واضح کی گئی ہے اور انسانی زندگی کو فانی اور عارضی قرار دیا گیا ہے۔

مولانا اکبرآبادی کی وفات کے بعد یہ افسوس ناک انکشاف ہوا کہ جن تین اہل علم (مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ، مفتی عتیق الرحمنؒ عثمانی اور مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ) نے ندوۃ المصنفین قائم کیا تھا اور جنہوں نے خود بھی متعدد کتابیں تصنیف کیں اور بہت سے حضرات کی کتابیں شائع فرمائیں، ان کی اولاد میں سے کوئی شخص نہ تو اس قابل ہے کہ تصنیفی و تالیفی خدمت انجام دے سکے اور نہ کسی میں یہ صلاحیت ہی پائی جاتی ہے کہ اس تحقیقی ادارے ندوۃ المصنفین یا "برہان" کو زندہ رکھ سکے۔ حالات ہر اعتبار سے

(باقی ص ۸۲ پر)

بقیہ: اللہ اور رسولؐ کی اطاعت

اور شاید آپ کی یہ عزیمت بہت سے دوسروں کے لئے مہمیز کا کام دے کر آمادۂ عمل کر سکے۔

اور رابعاً اس راستے پر بڑھتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے مدد و نصرت کا طلب گار رہنا ہے اور جہاں کہیں غلطی ہو یا گناہ سرزد ہو جائے اور اطاعت اور اتباع میں کوتاہی ہو جائے وہاں جلد از جلد توبہ و استغفار اور ندامت و افسوس سے اس کی تلافی کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ سب کو بھی حق کو سمجھنے اس پر عمل کرنے اور اسے دوسروں تک پہنچانے کی توفیق بخشے اور تادم آخر دین اسلام پر قائم رکھے۔ آمین۔

*****

ختمِ نبوّت اور علامہ محمد اقبال

سیّد شبیر حسین شاہ زاہد

ختمِ نبوت اساساتِ دین میں سے وہ اہم عقیدہ ہے' جو دوسرے تمام بنیادی عقائد پر ایک مسلمان کو مستحکم کرتا ہے' جبکہ اس عقیدہ کی عدم موجودگی میں دوسرے تمام عقائد کا ہونا بھی ایک مسلمان کو کفر میں گرنے سے نہیں بچا سکتا۔ دینی عقائد میں سے یہی وہ عقیدہ ہے' جس پر قولی و عملی ایمان افرادِ امت کے درمیان اخوت واتحاد اور ہمہ گیری کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ یہ عقیدہ نہ صرف قرآن مجید کی آیۂ ختمِ نبوت مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ (سورۃ الاحزاب۔ ۴۰) سے صریحاً اور آیۂ تکمیلِ دین اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (سورۃ المائدہ۔ ۳) سے وضاحتاً ثابت ہے۔ بلکہ قرآن پاک کی ایک سو دوسری آیات اسے اشارۃً و کنایۃً واضح کرتی ہیں۔ دو سو سے زیادہ احادیثِ نبویؐ سے یہ عقیدہ تفسیراً' تمثیلاً' تاکیداً اور حکماً مصدّق کیا گیا ہے۔ آغازِ اسلام سے لے کر آج تک تمام ادوار کے علماء' فقہا' اولیاء' اصفیاء' اتقیاء اور اہلِ علم حکمرانوں کے نزدیک یہ عقیدہ مسلّم چلا آرہا ہے۔ اس کے منکرین کے ارتداد و قتل کی حلّت پر اجماعِ صحابہؓ اسلامی تاریخ سے نہ صرف روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ بلکہ اس عقیدہ کی حفاظت وصیانت اور تشہیر کے مقاصد کی خاطر لڑنے مرنے والوں کو با اجماعِ صحابہؓ ہمیشہ غازی و شہید سمجھا گیا ہے۔

شاعرِ مشرق' مصوّرِ پاکستان ڈاکٹر سر علامہ محمد اقبال دنیائے اسلام کے عموماً اور مسلمانانِ ہند کے بالخصوص وہ رجلِ کبیر ہیں۔ جن کی شاعرانہ عظمت وشہرت اور اسلامی فکر و فلسفہ کا شہرہ چار دانگِ عالم میں مشہور ہے۔ ۹ر نومبر ۱۸۷۷ء کو سیالکوٹ میں نور محمد صاحب کے ہاں پیدا ہونے والی یہ عظیم ہستی نہ صرف دینی عقائد و اسلامی علوم پر گہری نظر رکھتی تھی۔ بلکہ اسلامی تاریخ میں آنے والے تغیرات و انقلاب (مشرکانہ و مخالفِ اسلام تحریکوں) پر اُن کی فلسفیانہ و

عالمانہ نظر تھی۔ دوسرے دینی عقائد کے علاوہ تحریکِ احمدیت کے ضمن میں ختمِ نبوتؐ کے بارے میں آپ کے نظریات اور منکرینِ ختمِ نبوت یعنی احمدیوں کا محاسبہ وہ بھی منظرِ عام پر آیا۔ مرزا غلام احمد قادیانی اور قادیانیت کے حوالے سے علامہ صاحب نے ہندوستان کی سیاسی فضاء میں مسلمانانِ ہند کے الگ ملی تشخص اور امتیازی دینی حیثیت کے حوالے سے جو کوششیں کیں۔ وہ آپ کے عقیدۂ ختمِ نبوتؐ پر عملی ایمان کے سلسلے میں شاہد ہیں۔ جن سے انکار ممکن نہیں۔

علامہ اقبال نے ختمِ نبوت کی تشریح و تعبیر اور منکرین (فرقۂ احمدیت) کے محاسبہ کے سلسلے میں تین طرح کے اقدامات کئے۔ اولاً عقیدۂ ختمِ نبوتؐ کو اپنے شاعرانہ کلام کے ذریعے عام کیا اور منکرین کی موشگافیوں کا ابطال کیا۔ ثانیاً منکرینِ ختمِ نبوت کے شخصی و جماعتی نظریات و عقائد پر گرفت کی اور ان کا سیاسی محاسبہ کیا۔ ثالثاً منکرینِ ختمِ نبوتؐ کے نام نہاد حمایتیوں کے شکوک رفع کر کے اسلام اور عام ہندوستانی مسلمانوں کو قادیانیت کے مکروہ نظریات و باطل عزائم سے متاثر ہونے سے بچایا۔ ختمِ نبوت کے سلسلے میں آپ نے رہوارِ تخیل کو یوں عازمِ منزل کیا۔

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد — بر رسولِ ما رسالت ختم کرد
رونقِ از ما محفلِ ایام را — او رسل را ختم و ما اقوام را
خدمتِ ساقی گری با ما گذاشت — داد ما را آخریں جامے کہ داشت
لا نبی بعدی اصانِ خداست — پردۂ ناموسِ دینِ مصطفےٰ است
قوم را سرمایۂ قوت از دو — حفظِ سرِّ وحدتِ ملت از دو!!
حق تعالیٰ نقشِ ہر دعویٰ شکست — تا ابد اسلام را شیرازہ بست
دل ز غیر اللہ مسلماں بر کند! — نعرۂ لا قوم بعدی سے زند

(مثنوی اسرار و رموز ص ۱۱۸)

اردو کلام میں آپ کے دو اشعار زبان زدِ خاص و عام ہیں جو اپنے اندر ختمِ نبوتؐ کا مفہوم لئے ہوئے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

وہ دانائے سُبل، ختمِ رسل، مولائے کل، جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں، وہی طٰہٰ

ختم نبوتؐ کی تشریح و تعبیر اور منکرین کے عقائد کا موازنہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ.....

(۱) "رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ رسالتؐ پر ایمان ہی وہ حقیقت ہے جو مسلم اور غیر مسلم کے درمیان وجہ امتیاز ہے۔ اور اس امر کے لئے فیصلہ کن ہے کہ فرد یا گروہ ملتِ اسلامیہ میں شامل ہے کہ نہیں..... میری رائے میں قادیانیوں کے سامنے دو راہیں ہیں۔ یا وہ اعلان کریں کہ الگ امت ہیں۔ یا ختمِ نبوت کی تاویلیں چھوڑ کر اسے پورے مفہوم کے ساتھ قبول کریں۔" (حرفِ اقبال)

(۲) "اسلام لازماً ایک دینی جماعت ہے۔ جس کی حدود مقرر ہیں یعنی وحدت والوہیت پر ایمان، انبیاء پر ایمان اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم رسالت پر ایمان۔ دراصل یہ یقین ہی وہ حقیقت ہے۔ جو مسلم اور غیر مسلم کے درمیان وجہ امتیاز ہے اور اس امر کے لئے فیصلہ کن ہے۔ کہ فرد یا گروہ ملتِ اسلامیہ میں شامل ہے یا نہیں۔ مثلاً ہر ہموسماج خدا پر یقین رکھتے ہیں۔ اور رسولِ کریمؐ کو خدا کا پیغمبر مانتے ہیں لیکن انہیں ملتِ اسلامیہ میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ قادیانیوں کی طرح وہ وحی کے تسلسل پر ایمان رکھتے ہیں اور رسول کریمؐ کی ختمِ نبوت کو نہیں مانتے۔" (حرفِ اقبال)

(۳) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیروؤں کو ایسا قانون عطا کر کے، جو ضمیرِ انسانی کی گہرائیوں سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ آزادی کا راستہ دکھایا ہے۔ کسی اور انسانی ہستی کے آگے روحانی حیثیت سے سرِ نیاز خم نہ کیا جائے۔ دینیاتی نقطۂ نظر کو یوں بیان کر سکتے ہیں۔ کہ وہ اجتماعی اور سیاسی تنظیم، جسے اسلام کہتے ہیں، مکمل اور ابدی ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی ایسے الہام کا امکان ہی نہیں جس کا انکار کفر کو مستلزم ہو۔ جو شخص ایسے الہام کا دعویٰ کرتا ہے وہ اسلام سے غدّاری کرتا ہے۔" (حرفِ اقبال)

(۴) "ختمِ نبوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص بعد اسلام اگر یہ دعویٰ کرے کہ مجھے الہام ہوتا ہے اور میری جماعت میں داخل نہ ہونے والا کافر ہے۔ تو وہ شخص کاذب ہے اور واجب القتل۔ مسیلمہ کذاب کو اسی بناء پر قتل کیا گیا حالانکہ جیسا کہ طبری لکھتا ہے وہ حضورؐ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا قائل تھا۔ اور اس کی اذان میں حضور اکرمؐ کی نبوتؐ کی تصدیق کی جاتی تھی۔" (انوارِ اقبال)

علامہ اقبال کی رائے میں اگر مرزا قادیانی نبوّت کا دعویٰ نہ بھی کرتا اور صرف جہاد کی مخالفت پر اکتفا کرتا۔ تو تب بھی وہ امتِ محمدیہ میں شامل نہیں رہ سکتا تھا۔ کیونکہ فرضیتِ جہاد کا حکم قرآن حکیم میں موجود ہے قرآن کریم کی کسی نصّ کا انکار ہی دائرہ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ علامہ کے نزدیک ایسی نبوت "برگِ حشیش" کی مانند ہے۔ جس کے عناصر میں قوت و شوکت (یعنی جہاد) کا پیغام نہ ہو۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ

وہ نبوت ہے مسلماں کے لئے برگِ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام (ضربِ کلیم)

مرزا غلام احمد قادیانی کے عقیدۂ باطلہ متعلقہ تنسیخِ جہاد کا فلسفیانہ تجزیہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"مسلمان عوام کو جن میں مذہبی جذبہ بہت شدید ہے۔ صرف ایک چیز قطعی طور پر متاثر کر سکتی ہے۔ یعنی وحی کی سند' رائج عقائد کو مؤثر طریق پر جڑ بنیاد سے اکھیڑنے اور مذکورہ بالا سوالات میں جو دینی نظریات مضمر ہیں ان کی ایک ایسی تفسیر و تعبیر کرنے کے لئے جو سیاسی طور پر مفید طلب ہو۔ یہ ضروری سمجھا گیا کہ اس (تنسیخ جہاد) کی بنیاد وحی پر رکھی جائے۔ یہ بنیاد احمدیت نے فراہم کر دی۔ خود احمدیوں کا دعویٰ ہے کہ برطانوی شہنشاہیت کی یہ سب سے بڑی خدمت ہے جو انہوں نے سرانجام دی ہے۔" (یعنی عقیدۂ جہاد کو ختم کرنے کے لئے کوشش کی ہے) (احمدیت اور اسلام ص ۱۲۶)

علامہ اقبال نے منکرینِ ختمِ نبوت کے سرخیل مرزا غلام احمد قادیانی کے عقائد و افکار کی روشنی میں اس کے کردار پر بھی لکھا ہے۔ شاید آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس باطل تحریک (قادیانیت) کے چہرے سے نقاب اٹھایا۔ اور بانیٔ تحریک کے "الہامات" کی باحتیاط نفسی تحلیل کی فرماتے ہیں۔

"مسلمانوں کے مذہبی افکار کی تاریخ میں احمدیوں نے جو کارِ نمایاں سرانجام دیا۔ وہ یہی ہے کہ (تعلیماتِ اطاعت برطانوی حکومت کے ذریعے) ہندوستان کی موجودہ غلامی کے لئے وحی کی سند مہیّا کر دی جائے۔ (احمدیت اور اسلام انگریزی ایڈیشن ص ۱۲۷)

مرزا قادیانی کے اسی عقیدۂ اطاعتِ برطانیہ پر یوں اظہارِ خیال فرماتے ہیں۔

فتنۂ ملّتِ بیضا ہے امامت اس کی
جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے (ضربِ کلیم)

وحدتِ افکار اور بانی قادیانی تحریک کے مفسدانہ عقیدہ کا ذکر کرتے ہوئے یوں گویا ہیں۔

ہے زندہ فقط وحدتِ افکار سے ملّت
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد
محکوم کے الہام سے اللہ بچائے !
غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز (ضرب کلیم)

مرزا قادیانی کے اپنے کو حق 'اپنے ماننے والوں کو ناجی و مسلمان اور نہ ماننے والوں کو کافر قرار دینے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں

پنجاب کے اربابِ نبوت کی شریعت
کہتی ہے کہ یہ مومنِ پارینہ ہے کافر (ضرب کلیم)

مرزا غلام احمد قادیانی کی ملتِ اسلامیہ سے غداری اور حکومتِ برطانیہ سے وفاداری کو کس جگر سوزی سے بیان کرتے ہیں۔

عصرے من پیغمبرے ہم آفرید
آں کہ در قرآن جز خود را ندید
ازدمِ او وحدتِ قومے دو نیم
کس حریفش نیست جز چوبِ کلیم (ضربِ کلیم)

حضرت علامہ اقبال نے تحریکِ منکرِ ختمِ نبوت (احمدیت) کا سیاسی میدان میں بھی پیچھا کیا۔ اور ان کے سیاسی اغراض و مقاصد کھول کھول کر مسلمانانِ ہند کے سامنے پیش کر دیئے۔ ملتِ اسلامیہ اور ہندوستانی مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ان کے عزائم کی قلعی کھولی۔ فرماتے ہیں۔

"ہمیں قادیانیوں کی حکمتِ عملی اور دنیائے اسلام سے متعلق اُن کے رویہ کو فراموش نہیں کرنا چاہئے۔ جب قادیانی مذہبی اور معاشرتی معاملات میں علیحدگی کی پالیسی اختیار کرتے ہیں تو پھر سیاسی طور پر مسلمانوں میں شامل ہونے کے لئے کیوں مضطرب ہیں۔ ؟ ملتِ اسلامیہ کو اس مطالبہ کا پورا پورا حق حاصل ہے کہ قادیانیوں کو علیحدہ کر دیا جائے۔ اگر حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا تو مسلمانوں کو شک گزرے گا کہ حکومت اس نئے مذہب کی علیحدگی میں دیر کر رہی ہے کیونکہ ابھی قادیانی اس قابل نہیں کہ چوتھی جماعت کی حیثیت سے مسلمانوں کی برائے نام اکثریت کو ضرب پہنچا سکیں..... اگر حکومت کے لئے یہ گروہ مفید ہے تو وہ اس کی

خدمات کا صلہ دینے کی پوری طرح مجاز ہے۔ لیکن اس ملت کے لئے اُسے نظر انداز کرنا مشکل ہے جس کا اجتماعی وجود اس کے باعث خطرے میں ہے" (خط علامہ اقبال بنام سٹیٹس مین)

قادیانیوں کے خدشات اور ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی بیداری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"یہ بات بھی اتنی ہی درست ہے کہ قادیانی بھی ہندی مسلمانوں کی سیاسی بیداری پر پریشان ہو رہے ہیں۔ کیونکہ وہ (قادیانی) محسوس کرتے ہیں کہ ہندی مسلمانوں کے سیاسی وقار میں اضافہ اُن کے اس ارادے کو کہ وہ رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں سے ہندوستانی نبی کی امت تراش لیں، یقیناً ناکام بنادے گا۔"

پھر قادیانیوں کے اس سیاسی مسئلے کا آئینی حل تجویز فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ہندوستان کے حکمرانوں کے لئے بہترین طریقِ کار میرے خیال میں یہ ہے کہ وہ قادیانیوں کو ایک علیحدہ قوم قرار دے دیں۔ یہ بات خود قادیانیوں کے اپنے طریقِ کار کے عین مطابق ہوگی۔ اور ہندوستانی مسلمان اُن کو ویسے ہی برداشت کر لیں گے جیسا کہ وہ باقی مذہبوں کے پیروؤں کو برداشت کرتے ہیں۔"

اگرچہ علامہ اقبال قادیانیت سے متعلق کبھی خوش رائے نہ تھے۔ لیکن اس کے مضمرات کا مطالعہ انہوں نے آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے تجرباتی دور ۳۲۔ ۱۹۳۱ء میں کیا۔ اس کشمیر کمیٹی کے صدر مرزا بشیرالدین محمود تھے۔ علامہ اقبال نے یہ محسوس کر کے کہ کمیٹی کی آڑ میں قادیانیت کے عزائم پورے کئے جا رہے ہیں۔ سید محسن شاہ ایڈووکیٹ اور خان بہادر حاجی رحیم بخش کو ہم خیال بنایا (یہ کمیٹی کے ممبر تھے) اور لکھ دیا کہ آئندہ کمیٹی کا صدر غیر قادیانی ہو۔ ۱۷ر مئی ۱۹۳۳ء میں مرزا بشیرالدین محمود مستعفی ہو گیا۔ علامہ اقبال صدر منتخب کئے گئے۔ لیکن علامہ نے محسوس کیا کہ مرزائیوں نے ایک ایسا جال بچھا رکھا ہے جس سے کشمیر کمیٹی کی افادیت ختم ہو چکی ہے۔ آپ نے ۲۰ر جون ۱۹۳۳ء کو صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ اور ایک پریس بیان میں کہا کہ

"بدقسمتی سے کمیٹی میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے مذہبی فرقے (قادیانیت) کے امیر کے سوا کسی دوسرے کا اتباع کرنا سرے سے گناہ سمجھتے ہیں مجھے ایسے شخص سے ہمدردی ہے جو کسی روحانی سہارے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کسی مقبرے کا مجاور یا کسی زندہ نام نہاد پیر کا مرید بن جائے۔" (تحریک ختم نبوت ص ۹۷)

کشمیر کمیٹی کے بارے میں علامہ اقبال کا دوسرا بیان ۲ر اکتوبر ۱۹۳۳ء کو جاری ہوا۔ جس میں صدارت سے اپنی دستکشی کا سبب بیان کرتے ہوئے قادیانی امت کے پوشیدہ اغراض و مقاصد پر اشارے کئے کہ تحریکِ کشمیر کی آڑ میں کس طرح یہ فرقہ اپنا دامِ تزویر بچھا کر مسلمانوں کو شکار کر رہا ہے۔ سیاسی اختلاف کے اس واقعہ کے بعد علامہ اقبال نے اس تحریک' اس کے مقاصد' عقائد و نظریات اور دوسرے پہلوؤں کا بالاستیعاب مطالعہ شروع کیا۔ مذہبی حیثیت کے معاملہ میں سید سلیمان ندویؒ' علامہ انور شاہ محدث کشمیریؒ اور سید پیر مہر علی شاہؒ سے قلمی رابطہ قائم کیا۔ مکمل فلسفیانہ اور مذہبی مطالعہ کے بعد احمدیت کے بارے میں ۳ر مئی ۱۹۳۵ء کو بیان جاری کیا۔ جس سے قادیانی تلعہ میں تھرتھری پیدا ہو گئی جس سے انگریز سب سے زیادہ مضطرب ہوئے۔ اس لئے کہ "مرزا قادیانی انگریزوں کا ہی خود کاشتہ پودا تھا۔" [1] پنڈت جواہر لال نہرو نے مرزائی امت کے دفاع میں "ماڈرن ریویو" کلکتہ میں تین مقالے تحریر کئے۔ علامہ نے ان مقالوں کے جواب میں "اسلام اور احمدیت" کے عنوان سے ایک معرکۃ الآراء مقالہ لکھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو تو اس سے خاموش ہو گئے۔ لیکن خود قادیانی علماء و فضلاء بھی علامہ اقبال کے فلسفیانہ تجزیہ' علمی نکات اور واضح سوالات کے جواب میں کچھ نہ کہہ سکے۔ ۲۱ر جون ۱۹۳۶ء کو علامہ اقبال نے اپنے ایک نجی خط میں پنڈت جواہر لال نہرو کو یہ لکھ کر قادیانیوں کی سیاسی قسمت اور مذہبی حیثیت کا فیصلہ کر دیا کہ

"میرے ذہن میں اس سے متعلق کوئی ابہام نہیں کہ احمدی اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں"

پنڈت جواہر لال نہرو کے نام اپنے ذاتی خط میں قادیانیت اور اسلام کے بارے میں متعدد شبہات کا ازالہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

(۱) وہ (مرزا غلام احمد قادیانی) کہتا ہے کہ میں اسلام کے مقدّس پیغمبر کا بروز ہوں اس طرح وہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بروز ہونے کی صورت میں اس کی خاتمیت حقیقتہً خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت ہے۔ گویا معاملے کو اس نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ دونوں خاتمیتوں کو (اس کی اپنی اور

---

[1] مرزا غلام احمد قادیانی نے درخواست بحضور لیفٹیننٹ بہادر پنجاب خاکسار غلام احمد' مندرجہ تبلیغ رسالت جلد ہفتم ص۱۹ میں اپنے آپ کو انگریزوں کا خود کاشتہ پودا کہا ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت) ایک قرار دے کر وہ تصورِ خاتمیت کے زمانی مفہوم سے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔

(۲) یہ بھی کہا جاتا ہے اور اس سلسلے میں ہسپانیہ کے عظیم القدر مسلمان صوفی محی الدین ابن عربی کی سند پیش کی جاتی ہے کہ ایک مسلمان ولی کیلئے بھی روحانی ارتقاء کے دوران میں ایسے تجربات ممکن ہیں۔ جنہیں صرف شعورِ نبوت سے مختص مانا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شیخ محی الدین ابن عربی کا یہ نظریہ نفسیات کے نقطۂ نگاہ سے نامحکم ہے۔ لیکن اگر اسے درست مان بھی لیا جائے تو قادیانیوں کا استدلال شیخ محی الدین ابن عربی کے صحیح مؤقف سے متعلق کامل اغلط فہمی پر مبنی ہے۔ شیخ اسے خالصتاً ذاتی تجربہ قرار دیتے ہیں۔ جس کی بناء پر کوئی ان لوگوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار نہیں دے سکتا۔ جو اس پر اعتقاد نہ رکھیں۔ اور ایسا اصلاً ہو ہی نہیں سکتا۔ دراصل شیخ کے نقطۂ نگاہ کے مطابق ایک عہد یا ایک ملک میں ایک سے زیادہ ولی ہو سکتے ہیں۔ جو شعورِ نبوت تک پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ اگر مان بھی لیا جائے۔ ایک ولی کیلئے نفسیاتی اعتبار سے عرفانِ نبوت حاصل کر لینا ممکن ہے تو اس عرفان کی عمرانی و سیاسی اہمیت کوئی نہیں کیونکہ وہ کسی نئی تنظیم کا مرکز نہیں بن سکتا۔ اور اس اعلان کا حق دار نہیں ہو سکتا۔ کہ وہی تنظیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں کیلئے ایمان و کفر کا معیار ہے۔

شیخ محی الدین ابن عربی کی صوفیانہ نفسیات سے قطع نظر کرتے ہوئے میں "فتوحاتِ مکیہ" سے متعلقہ عبارتوں کا مطالعہ غور و احتیاط سے کر چکا ہوں اور مجھے یقین ہو چکا ہے کہ یہ عظیم القدر ہسپانوی صوفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت کا ویسا ہی پختہ معتقد ہے جیسا کوئی راسخ العقیدہ مسلمان ہو سکتا ہے۔ اگر اسے صوفیانہ کشف میں معلوم ہو جاتا کہ آگے چل کر مشرق میں تصوف کے بعض ہندوستانی عطائی اس کی صوفیانہ نفسیات کے پردے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت پر زد لگانے کیلئے تیار ہو جائیں گے۔ تو وہ علمائے ہند سے بھی پہلے دنیا کے مسلمانوں کو غدارانِ اسلام کے خلاف متنبہ کر دیتا۔

(۳) جس حد تک ہندوستان کا تعلق ہے۔ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ یہاں کے مسلمان کسی ایسے سیاسی نظریئے (تحریکِ احمدیت کی طرف اشارہ ہے) کے روبرو سرِ تسلیم خم نہ کریں گے۔ جو اُن کی مستقل تہذیبی حیثیت کو تباہ کر دے۔

مستقل تہذیبی حیثیت کے متعلق اطمینان ہو جائے تو مذہب اور حُبِ وطن کے تقاضوں میں ہم آہنگی کرنے کیلئے ان پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

میں ہز ہائی نس آغاخان (آغاخان سوم محمد شاہ کی طرف اشارہ ہے) کے متعلق بھی ایک بات کہنا چاہتا ہوں میرے لئے یہ معلوم کرنا دشوار ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے آغاخاں کو کیوں حملے کا نشانہ بنایا۔ شاید وہ سمجھتے ہیں کہ قادیانی اور اسماعیلی ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ وہ بظاہر اس حقیقت سے آگاہ نہیں کہ اسماعیلیوں کی فقہی تاویلات کتنی ہی غلط کیوں نہ ہوں 'اسلام کے بنیادی اصول پر ان کا ایمان ہے۔ بلاشبہ وہ دائمی امامت پر یقین رکھتے ہیں۔ لیکن اُن کے نزدیک امام ربّانی الہام کا حامل نہیں ہوتا۔ بلکہ صرف شریعت کا شارح ہوتا ہے۔ (جبکہ قادیانیوں کے یہاں یہ بات نہیں ہے)

(۴) یہاں یہ بھی بتا دینا چاہئے کہ تحریکِ احمدیت دو گروہوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک گروہ قادیانیوں کا ہے اور دوسرا لاہوریوں کا۔ قادیانی گروہ بانیٔ تحریک کو مکمل نبی تسلیم کرتا ہے۔ لیکن لاہوریوں نے اعتقاداً یا مصلحتاً یہی مناسب سمجھا کہ قادیانیت کو مدھم سُروں میں پیش کیا جائے۔ تاہم یہ مسئلہ کہ بانیٔ احمدیت ایسا نبی تھا۔ جس کی بعثت کا انکار مستلزمِ کفر ہو دونوں گروہوں کے درمیان محلِ نزاع ہے۔ احمدیوں کی اس داخلی کشمکش کے سلسلے میں یہ فیصلہ کرنا کہ کون حق بجانب ہے۔ میرے پیشِ نظر مقصد کیلئے غیر ضروری ہے۔ میں سمجھتا ہوں اور اس کے وجوہ ابھی پیش کروں گا کہ ایسے نبی کا خیال جس کا انکار ملت سے خارج ہونے کو مستلزم ہو احمدیت کی اصل واساس ہے اور قادیانیوں کا موجودہ امام لاہوری امام کے مقابلے میں روحِ تحریک سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔ (یعنی حاملینِ عقیدہ ختم نبوتؐ کو کافر قرار دینے میں تیز ہے)

چونکہ قادیانیوں کا عقیدہ ہے کہ بانیٔ احمدیت الہام کا حامل تھا۔ لہٰذا وہ پوری دنیائے اسلام کو کافر قرار دیتے ہیں۔ خود بانیٔ تحریک کا استدلال جو صرف قرونِ وسطیٰ کے علم الکلام کے لئے زیبا سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ ہے کہ اگر اسلام کے مقدس پیغمبرؐ کی روحانیت دوسرے نبی کی تخلیق نہ کرے تو اس روحانیت کو ناکام سمجھا جائے گا۔ وہ اپنی نبوت کو اسلام کے مقدس پیغمبرؐ کی نبوت پرور روحانی قوت کی شہادت قرار دیتا ہے۔ لیکن اگر آپ یہ سوال کریں کہ آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت ایک سے زیادہ

پیغمبروں کی تربیت بھی فرما سکتی ہے۔ تو اس کا جواب نفی میں دیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب صاف الفاظ میں یہ ہوا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم (معاذ اللہ) آخری نبی نہ تھے۔ آخری نبی میں (مرزا قادیانی) ہوں۔

ڈاکٹر علامہ اقبال نے تحریکِ احمدیت اور فتنۂ قادیانیت پر تبصرہ کرتے ہوئے حرفِ اقبال میں لکھا ہے کہ

کیا یہ مناسب ہے کہ اصل جماعت (جمہور مسلمانانِ ہندوستان) کو رواداری کی تلقین کی جائے۔ حالانکہ اس کی وحدت خطرہ میں ہو اور باغی گروہ کو تبلیغ کی پوری اجازت ہو۔ اگرچہ وہ تبلیغ دشنام سے لبریز ہو۔

میں سمجھتا ہوں کہ قادیانیوں کی تفریق کی پالیسی کے پیشِ نظر جو انہوں نے مذہبی اور معاشرتی معاملات میں ایک نئی نبوت کا اعلان کر کے اختیار کی ہے خود حکومت کا فرض ہے کہ وہ قادیانیوں اور مسلمانوں کے بنیادی اختلافات کا لحاظ رکھتے ہوئے آئینی اقدام اٹھائے اور اس کا انتظار نہ کرے کہ مسلمان کب (اُن کی علیحدگی کا) مطالبہ کرتے ہیں۔

آپ چاہتے ہیں کہ میں واضح کر دوں کہ حکومت جب کسی جماعت کے مذہبی اختلافات کو تسلیم کرتی ہے تو میں اُسے کس حد تک گوارا کر سکتا ہوں۔ سو عرض ہے کہ اولاً اسلام لازماً ایک دینی جماعت ہے۔ جس کے حدود مقرر ہیں۔ یعنی وحدتِ الوہیت پر ایمان، انبیاء پر ایمان اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ رسالت پر ایمان۔ دراصل یہ آخری یقین ہی وہ حقیقت ہے جو مسلم اور غیر مسلم کے درمیان وجۂ امتیاز ہے۔ ثانیاً ہمیں قادیانیوں کی حکمتِ عملی اور دنیائے اسلام سے متعلق اُن کے روئیے کو فراموش نہیں کرنا چاہئے۔ بانیٔ تحریک (مرزا قادیانی) نے ملتِ اسلامیہ کو سڑے ہوئے دودھ سے تشبیہ دی تھی اور اپنی جماعت کو تازہ دودھ سے اور اپنے مقلدین کو ملتِ اسلامیہ سے میل جول رکھنے سے اجتناب کا حکم دیا تھا۔ علاوہ بریں ان کا بنیادی اصولوں سے انکار، اپنی جماعت کا نیا نام (احمدی)، مسلمانوں کی قیامِ نماز سے قطع تعلقی، نکاح وغیرہ کے معاملات میں مسلمانوں سے بائیکاٹ اور ان سب سے بڑھ کر یہ اعلان کہ دنیائے اسلام کافر ہے۔ یہ تمام امور قادیانیوں کی علیحدگی پر دال ہیں۔ ثالثاً اس امر کو سمجھنے کیلئے کسی خاص ذہانت یا غور و فکر کی ضرورت نہیں ہے کہ جب قادیانی

مذہبی اور معاشرتی معاملات میں علیحدگی کی پالیسی اختیار کرتے ہیں تو پھر وہ سیاسی طور پر مسلمانوں میں شامل رہنے کیلئے کیوں مضطرب ہیں؟ علاوہ سرکاری ملازمتوں کے فوائد[1] — کے ان کی موجودہ آبادی جو چھپن ہزار ہے۔ انہیں کسی اسمبلی میں ایک نشست بھی نہیں دلا سکتی اور اس طرح انہیں سیاسی اقلیت کی حیثیت بھی نہیں مل سکتی۔ یہ واقعہ اس امر کا ثبوت ہے کہ قادیانیوں نے اپنی جداگانہ سیاسی حیثیت کا مطالبہ نہیں کیا کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ مجالسِ قانون ساز میں (علیحدگی کی صورت میں) ان کی نمائندگی نہیں ہو سکتی (خط علامہ اقبال بنام اسٹیٹس مین (دہلی) منقول از حرفِ اقبال)

علامہ اقبالؒ کی یہی دینی وسیاسی فہم وفراست تھی۔ جس کی بناء پر آپ نے نہ صرف منکرینِ ختم نبوتؐ (قادیانیوں) کے عقائد ونظریات اور اسلام پر اس کے منفی اثرات کو محسوس کیا۔ بلکہ سیاسی میدان میں ان کے مفاد پرستانہ ومنافقانہ مقاصد کو بھی سمجھ لیا۔ اور پھر نہ صرف اپنے تجزیات اور رائے سے مسلمانانِ ہندوستان کو باخبر رکھا بلکہ غلط فہمیوں کا شکار اور شکوک پھیلانے والے غیر مسلم حلقوں پر بھی احمدیوں کی اصلی تصویر ظاہر کی۔ یہ علامہ اقبال کا عشقِ رسولؐ ہی تھا۔ جس نے ان کو حاکمانِ وقت کی پروردہ جماعت کی مخالفت و محاسبے پر ابھارا۔ ورنہ اس دور میں ہندوستانی سیاست دان مصلحتوں کی بھینٹ چڑھ گئے تھے اور حکومتِ وقت کی مخالفت مول لینے کو تیار نہ تھے۔ جو کہ قادیانیت کی پشت پر تھی۔

قادیانی حضرات علامہ موصوفؒ کی ایک تقریر "ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر" کے ایک جملے کو بہت اچھالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ علامہ مرحومؒ قادیانی تحریک کو ٹھیٹھ اسلامی تہذیب کا نمونہ سمجھتے تھے۔ حالانکہ اس جملے کے بارے میں خود حضرت علامہؒ کی وضاحت موجود ہے۔ فرماتے ہیں۔

---

[1] مفادات کے سلسلہ میں بڑے بڑے امور کو چھوڑیئے۔ صرف سرکاری ملازمتوں کے شعبہ کو لیجئے۔ ہندوستان میں جب سرکاری ملازمتوں میں تناسب مقرر ہوا تو ہندوؤں کیلئے ۶۶½ فیصد، مسلمانوں کیلئے ۲۵ فیصد اور بقایا ۸½ فیصد "دیگر اقلیتوں" کیلئے طے ہوا تھا۔ دیگر اقلیتوں میں سکھ، پارسی، ہریجن، بدھ، جین، بہائی سب شامل تھے۔ ظاہر ہے کہ اگر احمدی بھی اپنے آپ کو مسلمانوں سے الگ شمار کرواتے۔ تو یہ انہی دیگر اقلیتوں کے زمرے میں شامل ہو جاتے۔ اس سے ان کو جس قدر ملازمتیں مل سکتی تھیں۔ وہ ظاہر ہے۔ (ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت ص نمبر ۱۲۵)

جہاں تک مجھے یاد ہے یہ تقریر میں نے ۱۹۱۱ء یا اس سے قبل کی تھی اور مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اب سے ربع صدی پیشتر مجھے اس تحریک سے اچھے نتائج کی امید تھی..... لیکن کسی مذہبی تحریک کی اصل روح ایک دن میں نمایاں نہیں ہوتی۔ اچھی طرح ظاہر ہونے کیلئے برسوں چاہئیں..... ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا تھا۔ جب ایک نئی نبوت..... بانی اسلامؐ کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت' کا دعویٰ کیا گیا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔ بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی۔ جب میں نے تحریک کے ایک رکن کو اپنے کانوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا۔ درخت جڑ سے نہیں پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ (حرف اقبالؒ)

مرزا غلام احمد قادیانی کے دعویٔ نبوت سے قبل بعض مسلمان اسے اسلام کا مخلص اور مسلمانوں کا بہی خواہ خیال کرتے تھے۔ خود حضرت علامہ کے بعض رشتہ دار حتیٰ کہ اُن کے والد شیخ نور محمد اور بڑے بھائی شیخ عطا محمد بھی مرزا غلام احمد سے متاثر تھے اور عیسائیوں سے مناظرہ کرنے کیلئے اس کی مالی امداد بھی کیا کرتے تھے۔ مگر جب مرزا کے مخفی عزائم و دعاوی بے نقاب ہوئے اور مسلمان کا سوادِ اعظم اس نئی بدحواس اور عالمِ بے علم سے الگ ہو گیا تو علامہ کے والد اور دوسرے رشتہ داروں نے بھی اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اس کا ثبوت خود مرزائیوں کی کتابوں میں موجود ہے۔ مثلاً

(ڈالٹر سر محمد اقبال جو سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ اُن کے والد کا نام شیخ نور محمد تھا..... شیخ نور محمد صاحب نے غالباً ۱۸۹۱ء یا ۱۸۹۲ء میں مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم اور سید حامد شاہ صاحب مرحوم کی تحریک پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام (نقل کفر کفر نباشد) کی بیعت کی تھی۔ ان دنوں سر محمد اقبال اسکول میں پڑھتے تھے اور اپنے باپ کی بیعت کے بعد وہ بھی اپنے آپ کو احمدیت میں شمار کرتے تھے اور حضرت مسیح موعود کے معتقد تھے۔ چونکہ سر اقبال کو بچپن سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ اس لئے ان دنوں میں انہوں نے سعد اللہ لدھیانوی کے خلاف حضرت مسیح موعود کی تائید میں ایک نظم بھی لکھی تھی۔ مگر اس کے چند سال بعد جب سر اقبال کالج میں پہنچے۔ تو اُن کے خیالات میں تبدیلی آ گئی اور انہوں نے اپنے باپ کو سمجھا بجھا کر احمدیت سے منحرف کر دیا۔ چنانچہ شیخ نور محمد صاحب نے حضرت مسیح موعود کی خدمت میں ایک خط لکھا۔ جس میں تحریر کیا کہ

"میرا نام اس جماعت سے الگ رکھیں" اس پر حضرت صاحب کا جواب میر حامد شاہ صاحب مرحوم کے نام گیا۔ جس میں لکھا تھا کہ "شیخ نور محمد کو کہہ دیویں کہ وہ جماعت سے ہی الگ نہیں بلکہ اسلام سے بھی الگ ہیں" (کافر قرار دے دیئے گئے) ..... ڈاکٹر سر محمد اقبال اپنی زندگی کے آخری ایام میں (احمدیت کے) شدید طور پر مخالف رہے اور ملک کے نو تعلیم یافتہ طبقہ میں احمدیت کے خلاف جو زہر پھیلا ہوا ہے، اُس کی بڑی وجہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کا مخالفانہ پروپیگنڈا تھا"۔ (سیرت المہدی جلد ۳ ص ۲۴۹ از مرزا بشیر احمد)

مرزا غلام احمد قادیانی کے ایک بیٹے کی تحریر آپ پڑھ چکے ہیں اب دوسرے بیٹے کا بیان بھی پڑھ لیجئے۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ علامہ اقبال قادیانیوں کی مخالفت کی وجہ سے اُنہیں کس قدر "ناپسند" تھے۔ بلکہ مبغوض تھے۔

"اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے تحت جماعتِ احمدیہ کے مخلصین کے اخلاص کو اور بھی زیادہ ظاہر کرنے کے ارادے سے نئے نئے لوگوں کو ہمارے مخالفوں کی صف میں لا کھڑا کر رہا ہے۔ پہلے احراری اٹھے پھر امراء، پھر پیروں، گدی نشینوں اور اخبار نویسوں کی ایک جماعت۔ ہندوستان کے سیاسی لیڈر ابھی تک خاموش تھے۔ اس طرح اعلیٰ عہدیدار خاموش تھے۔ یا کم از کم ظاہر میں خاموش تھے۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ یہ طوفانِ مخالفت فرو ہونے میں نہیں آتا اور بڑھتا ہی چلا جاتا ہے تو انہوں نے کہا کہ ہم پیچھے کیوں رہیں۔ اس خیال کا آنا تھا کہ ظفر علی خان صاحب نے ایک بیان جاری کر دیا۔ پھر ڈاکٹر سر اقبال کو خیال آ گیا کہ میں پیچھے کیوں رہوں (اور وہ بھی احمدیت کی مخالفت میں میدان میں کود پڑے)" (تقریر مرزا بشیر الدین محمود مطبوعہ الفضل قادیان ۳۰ مئی ۱۹۳۵ء)

لہٰذا اب عوام الناس کے دھوکہ کیلئے علامہ اقبالؒ کی تحریروں اور تقریروں کو توڑ مروڑ کر یا سیاق و سباق سے الگ کر کے پیش کرنے سے احمدی کسی صورت میں بھی اسلام اور مسلمانوں کی نظر میں مقبول و پسندیدہ نہیں ہو سکتے۔ بلکہ علامہ اقبالؒ کا مذہبی اور سیاسی سطح پر ان سے اختلاف تمام خاص و عام کی نظروں میں آ گیا ہے۔ وہ تو علامہ اقبالؒ قادیانی تحریک کے پھلنے پھولنے سے پہلے ہی (۱۹۳۸ء میں) فوت ہو گئے۔ ورنہ اگر آپ زندہ رہتے تو قادیانیوں کا محاسبہ کرتے رہتے اور سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا ظفر علی خانؒ اور تحفظِ ختم نبوتؐ کے

دوسرے پیروکاروں کو آپ کی ذات سے وہ استحکام نصیب ہوتا کہ یہ تحریک قیام پاکستان سے قبل ہی دم توڑ دیتی۔ اور وہ روح فرسا اور حوصلہ شکن واقعات ظہور میں نہ آتے۔ جن کا ظہور پاکستان اور ملتِ اسلام کیلئے خطرناک ثابت ہوا۔ بلکہ کئی واقعات کے اثرات ہمیشہ پاکستان کے استحکام کو مجروح کرتے رہیں گے۔ مثلاً تقسیمِ ہند کے وقت قادیانیوں کا جدا محضرنامہ پیش کرنا اور ضلع گورداسپور کو "ویٹی کن سٹیٹ سٹی" کی شکل دیئے جانے کا مطالبہ کرنا۔ جس پر انگریزوں نے یہ ضلع بھارت کے حوالے کر دیا اور بھارت نے اس ضلع کی راہ سے کشمیر میں اپنی فوجیں داخل کر کے انہیں حقِ خودارادیت سے محروم کر دیا۔ اگر علامہ اقبالؒ چند سال اور زندہ رہتے تو شاید قادیانیوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ نبوت پر ایمان نہ رکھنے اور اجرائے نبوت کا عقیدہ رکھنے کی بناء پر بہت پہلے غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا جاتا۔ جس کا مطالبہ علامہ مرحوم نے ۳۶۔ ۱۹۳۵ء میں اپنے بیانات میں کر دیا تھا کہ

"قادیانیوں کو مسلمانوں سے علیحدہ کر دیا جائے"

ہر قسم کے بال بیرنگز کے مرکز

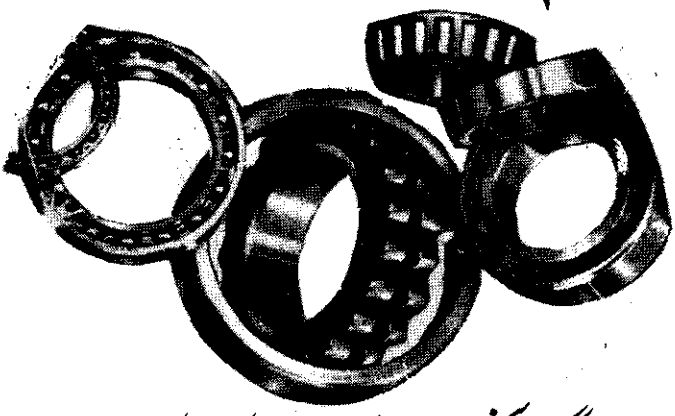

سندھ بیرنگ ایجنسی۔ ۶۵۰۔ منظور اسکوائر پلازہ کوارٹرز۔ کراچی۔ فون: ۷۲۳۳۵۸ ۷۲۱۱۷۲
خالد ٹریڈرز۔ بالمقابل کے۔ایم۔سی ورکشاپ۔ نشتر روڈ۔ کراچی
فون: ۷۳۵۸۸۲—۷۳۲۹۵۲—۷۳۰۵۹۵

بقیہ: عرض احوال

ان کی بات زیادہ توجہ سے سنیں گے۔ اس دوران میں وہ لوگوں تک پہنچنے کے ذرائع تلاش کریں۔ انہیں اپنے ووٹ کا حق بھی استعمال کرنا چاہئے لیکن اس کے لئے وہ کسی اثرورسوخ سے متاثر نہیں ہوں گے۔ ان کے ووٹ کا مستحق صرف وہ امیدوار ہو گا جس کی اپنی زندگی میں اسلام یعنی اللہ کی فرمانبرداری کا عکس نمایاں طور پر موجود ہو اور اگر وہ کسی جماعت یا سیاسی دھڑے کی نمائندگی کر رہا ہے تو اس کے منشور میں خلاف دین کوئی پروگرام شامل نہ ہو۔ ان دو شرائط کے ساتھ اگر ووٹ دینے کا موقع موجود ہے تو اس کے استعمال کو فرض جانیں بصورت دیگر وہ مجبور نہیں کئے جاسکتے۔ سو فیصد ووٹ تو کسی بھی الیکشن میں کاسٹ نہیں ہوتے۔ ووٹ دینا ایک شخص مخصوص کی اہلیت پر گواہی کے مترادف ہے اور جھوٹی گواہی دینے سے خاموشی اختیار کرنا یقیناً بہتر ہے۔

انتخابات کے بارے میں تنظیم اسلامی کی پالیسی

حالیہ انتخابات کے ضمن میں تنظیم اسلامی کی پالیسی کو واضح شکل دینے کے لئے گذشتہ ماہ امیر تنظیم اسلامی نے لاہور میں موجود اراکین مجلس مشاورت کا ایک ہنگامی اجلاس طلب کیا جس میں اسلام آباد سے میجر محمد امین منہاس صاحب کو بطور خاص دعوت دی گئی تھی کہ وہ اس سلسلے میں اپنے ذہن میں کچھ معین تجاویز رکھتے تھے۔ اس مشاورت میں انتخابات کے بارے میں تنظیم کی اسی سابقہ پالیسی کو برقرار رکھنے کا فیصلہ ہوا جس کا ذکر اس سے قبل اپریل ۸۸ء کے 'میثاق' میں صراحت کے ساتھ آچکا ہے۔ اس اہم فیصلے کی نقل بطور یادداشت ہدیۂ قارئین کی جارہی ہے۔

(الف) تنظیم اسلامی بحیثیت "تنظیم" انتخابات میں حصہ نہیں لے گی۔ نہ ہی کسی 'امیدوار' یا کسی 'جماعت' یا کسی 'محاذ' کے لئے تنظیم اسلامی یا اس کے رفقاء کوئی کنونسنگ یا عملی تعاون کریں گے۔

(ب) جہاں تک رفقائے تنظیم کے حق رائے دہی کا تعلق ہے جو ایک دوسرے اعتبار سے ایک امانت کی ادائیگی ہے، اُس کے ضمن میں طے کیا گیا کہ رفقائے تنظیم اپنا ووٹ کسی ایسے امیدوار کے حق میں استعمال کر سکتے ہیں جو:

(i) خود بھی پابندِ شریعت ہو ——— اور

(ii) کسی ایسی جماعت سے وابستہ نہ ہو جس کا منشور اسلامی اصولوں سے متصادم ہو۔

صراحتیں:

۱۔ مندرجہ بالا اصول و مبادی میں "انتخابات" سے اصلاً مراد قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے وہ انتخابات ہیں، جن کے نتیجے میں کاروبارِ مملکت چلانے کے لئے ایوانات اور حکومتیں تشکیل پاتی ہیں۔ جن کے حیطۂ اختیار میں قانون سازی اور جن کے ہاتھوں میں قوتِ نافذہ کی زمام کار ہوتی ہے۔

۲۔ البتہ اِن "انتخابات" کے ذیل میں نیم سرکاری (SEMI-GOVERNAMENT ———) ادارے بھی شامل ہیں، جیسے بلدیاتی اور کونسلوں کے انتخابات وغیرہ۔

۳۔ تنظیم اسلامی "بحیثیتِ تنظیم" ایسے کسی انتخاب میں حصّہ نہیں لے گی۔ یہ بات مندرجہ اصول و مبادی میں بصراحت موجود ہے۔ تنظیم کا کوئی رفیق بھی ایسے کسی انتخاب میں ذاتی، انفرادی، شخصی حیثیت سے بھی حصّہ نہیں لے سکے گا۔ اس کی خلاف ورزی فسخِ بیعت اور اخراج عن التنظیم کی مستوجب ہوگی۔

۴۔ کالجوں، یونیورسٹیوں کی غیر جماعتی یونینوں کے انتخابات میں رفقائے تنظیم انفرادی حیثیت سے حصّہ لینے کے مجاز ہوں گے۔ اسی کا اطلاق ٹریڈ یونینوں کے انتخاب پر بھی ہوگا۔ لیکن اس کے لئے رفقائے تنظیم کے لئے لازمی ہوگا کہ وہ امیرِ تنظیم یا مقامی تنظیموں کے امراء سے پیشگی اجازت حاصل کریں۔

کاروانِ خوشبو

بیرونِ پاکستان رفقاء تنظیم کی سرگرمیاں

مرتب: محمد احمد خاں

دور جدید کی ایجادات میں کیسٹس (CASSETTES) کو ذرائع ابلاغ کے میدان میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس ایجاد کے ذریعے جہاں شر بہت سرعت سے پھیلا ہے وہاں فلیبلغ الشاھد الغائب کے مخاطبین کو بھی اپنے کام میں قدرے آسانی ہو گئی ہے۔ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ اس کے ذریعے دنیا کے کس کس کونے میں کلام الٰہی کا علم و فہم اور اس کی دعوت پہنچ چکے ہیں ۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ قرآن کے عطا کردہ اجتماعی نظام کے مطابق ایک اجتماعی معاشرہ تشکیل دیا جائے اور نوع انسانی کے سامنے عملی نمونہ پیش کیا جائے تاکہ لوگ بچشم سر اس نظام کی برکات و خوبیاں ملاحظہ کر سکیں۔ تنظیم اسلامی بھی ایک ایسا ہی کارواں ہے جو کلام الٰہی کی خوشبو پھیلانے کا بیڑا اٹھائے ہوئے میدانِ عمل میں رواں دواں ہے۔ اس کے رفقاء جہاں وطنِ عزیز میں مسلمانوں کو بھولے ہوئے سبق کی یاد دہانی کروانے میں مشغول ہیں، وہاں دیارِ غیر میں بھی ان کی سرگرمیاں مثال پیش کرتی ہیں۔ آیئے آج اپنے بیرون وطن مقیم رفقاء کی سرگرمیوں کا جائزہ لیں جو ہزارہا مشکلات کے باوجود قوت ایمانی کے بل بوتے پر قرآن حکیم کی انقلابی دعوت پھیلانے میں مصروف عمل ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان کے عزم کو جواں رکھے اور انہیں دین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

امیر محترم ۱۹۷۸ء میں پہلی بار بعض احباب کی دعوت پر قرآن کی انقلابی دعوت کو متعارف کرانے امریکہ اور کناڈا تشریف لے گئے تھے۔ یہ دورہ بیرون پاکستان تبلیغی سرگرمیوں اور دوروں کے ایک باقاعدہ سلسلے کی تمہید بن گیا۔ اگلے برس ٹورنٹو اور شکاگو میں مقامی تنظیموں کا قیام عمل میں آیا..... جہاں مرکزی انجمن خدام القرآن کی ذیلی انجمنیں (SOCIETY OF SERVANTS OF AL-QURAN) بھی قائم ہوئیں۔ ٹورنٹو کی تنظیم

ایک نمایاں حیثیت اس اعتبار سے رکھتی ہے کہ وہاں کے رفقاء کا ایک مخصوص طریق کار دعوت پھیلانے کے ضمن میں سامنے آیا ہے۔ وہ لوگ اپنے مقامی امیر تنظیم ڈاکٹر عبدالفتاح صاحب کی قیادت میں اجتماعی طور پر مختلف مقامات کے ٹور کرتے ہیں اور قرآن کی انقلابی دعوت پیش کرتے ہیں۔ اس قسم کی سعی وجہد کے نتیجہ میں بفضلہٖ تعالیٰ مشی گن میں تنظیم کا قیام عمل میں آیا اور آج کل محترم ڈاکٹر عبدالفتاح صاحب اور ان کے رفقاء کا ہدف سینٹ لوئس اور واشنگٹن ہیں۔ آئندہ برس یعنی ۱۹۸۹ء میں ایک دس روزہ سمر کیمپ (SUMMER CAMP) کی تیاری پورے زور شور سے ہو رہی ہے۔ جہاں امیر محترم خود شرکت فرمائیں گے۔ امید ہے کہ یہ کیمپ امریکہ و کناڈا میں قرآن کی انقلابی دعوت کے حوالے سے اپنی نوع کا ایک منفرد اجتماع ہو گا۔ انسانی صلاحیت کا ایک عظیم سرمایہ شمالی امریکہ میں موجود ہے۔ کیا عجب کہ دیار فرنگ ہی سے قرآن کی انقلابی دعوت اٹھے اور دنیا بھر کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔ امریکہ کی ریاست ٹیکساس میں بھی ہمارے چند نوجوان ساتھی دعوت قرآنی کو پھیلانے کیلئے مقدور بھر جدوجہد میں مصروف ہیں اور نجانے کہاں کہاں اور کون کون اس مبارک فریضہ کو ادا کرنے میں لگا ہوا ہے۔ ہم دعاگو ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے جانے پہچانے ساتھیوں اور انجانے دوستوں سب پر اپنی رحمتیں وبرکتیں نازل فرمائیں۔ ..... آمین

مشرق وسطیٰ میں ایک کثیر تعداد پاکستانیوں کی محنت ومزدوری میں مصروف ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہاں بھی تنظیم اسلامی کی دعوت اکثر وبیشتر امریکہ و کناڈا سے ہی پہنچ کر متعارف ہوئی ہے۔ امیر محترم اکثر اس کا ذکر فرمایا کرتے ہیں کہ پاکستان کے شہروں میں تو ہماری دعوت متعارف ہو ہی چکی تھی، مگر دیہاتوں میں ہماری دعوت مشرق وسطیٰ سے پہنچی ہے۔ وہ اس طرح کہ وہاں مقیم رفقاء کی اکثریت دیہات سے تعلق رکھتی ہے۔ انہوں نے جب اپنے دیہاتوں میں جا کر کام کیا تو آج ہمارے رفقاء میں ایک کثیر تعداد دیہاتی بھائیوں کی ہے۔ بعض عرب ممالک میں مخصوص حالات وپالیسی کے باعث رفقاء کھل کر باقاعدہ عوامی سطح پر دعوت پیش نہیں کر سکتے، لیکن پھر بھی وہاں لٹریچر اور کیسٹس جس تیزی کے ساتھ پھیلائے جا رہے ہیں۔ اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ناسازگار حالات میں بھی اللہ تعالیٰ نے ہمارے رفقاء کو وہ جذبۂ ایمانی عطا فرما رکھا ہے کہ ہمیں بھی ان پر رشک آتا ہے۔

مشرق وسطیٰ کی سب سے بڑی مقامی تنظیم ابوظہبی میں قائم ہے۔ یہاں رفقاء کی تعداد اس وقت مرکزی ریکارڈ کے مطابق ۸۰ ہے اور یہاں جمعیت خدام القرآن کے نام سے ذیلی

انجمن بھی قائم ہے۔ حال ہی میں پاکستان مرکز کے قریب ہی ایک وسیع فلیٹ میں دفتر ودارالمطالعہ قائم کیا گیا ہے۔ کوشش کی جاتی ہے کہ ہر برس امیر محترم کا پروگرام عوامی سطح پر رکھا جائے..... ہمارے ابوظہبی کے رفقاء کی سعی وجہد کے نتیجے میں اب تمام عرب امارات میں تنظیمی سطح پر رابطے قائم ہو رہے ہیں۔ دوبئی میں مقامی دفتر کا قیام عمل میں آچکا ہے۔ راس الخیمہ اور کویت میں بھی اس نہج پر کام ہو رہا ہے۔ امید ہے انشاء اللہ جلد ہی وہاں بھی حلقے وجود میں آجائیں گے۔ بیرونِ پاکستان جہاں دعوتی کام پر زور دیا جاتا ہے وہاں الحمد للہ تربیتی کام پر بھی اسی قدر توجہ دی جاتی ہے۔ ان علاقوں میں حسبِ سہولت باقاعدگی کے ساتھ ایک روزہ ورکشاپس منعقد کئے جاتے ہیں اور تنظیمی لٹریچر کا اجتماعی مطالعہ پھر اس کے مختلف پہلوؤں پر غور وفکر ان پروگراموں کا مستقل حصہ ہوتے ہیں۔ یہ وہی طریق کار ہے جو بزرگ رفیق محترم سراج الحق سید صاحب نے متعارف کروایا تھا اور بہت مقبول ہوا۔ بیرونِ پاکستان تنظیمی اجتماعات میں حاضری بھی پاکستان میں اجتماعات کے مقابلہ میں حیران کن حد تک زیادہ ہوتی ہے یعنی ۸۰ تا ۹۰ فیصد تک غیر حاضر رفقاء میں سے اکثریت یا تو چھٹی پر پاکستان آئی ہوئی ہوتی ہے یا ڈیوٹی کا وقت ہونے کے باعث وہ اجتماعات میں حاضر ہونے سے قاصر ہوتے ہیں۔ یہ تحریر انجمن خدّام القرآن انڈیا حیدر آباد کا ذکر کئے بغیر نامکمل ہی رہے گی۔ جہاں انجمن ہذا کے روح رواں محترم حیدر محی الدین غوری نے احباب کے تعاون سے خطو کتابت کورس کا آغاز مقامی طور پر کر دیا ہے اور قرآنی دعوت کا کام بھی نہایت تیزی سے پھیل رہا ہے۔ میثاق اور حکمت قرآن پھیلانے کیلئے جس لگن سے وہاں کام ہو رہا ہے۔ اس کے نتائج بھی بڑے ہی حوصلہ افزاء ظاہر ہو رہے ہیں۔ آیئے آج پھر عزم تازہ کریں اور قرآن کے انقلابی فکر کو پھیلانے اور تن من دھن سے دین کی خدمت اور سربلندی کیلئے کمربستہ ہو جائیں۔

کوئٹہ میں ایمان کی بہار

امیر تنظیم اسلامی کے دو روزہ دورے کی رُوداد

امیر تنظیم اسلامی کا حالیہ دورہ اُن کے پچھلے دورۂ جون میں ہی طے پا گیا تھا جس میں موضوع اور مقام بھی خود امیر محترم طے کر چکے تھے۔ اس سے قبل کوئٹہ میں امیر محترم کے اکثر دروس وخطابات شہر کی مختلف مساجد میں ہوا کرتے تھے۔ پچھلی مرتبہ تجرباتی طور پر ڈاکٹر صاحب

کا ایک خطاب گورنمنٹ سائنس کالج کوئٹہ کے آڈیٹوریم میں رکھا گیا۔ امیر محترم نے اس مقام کو کافی پسند فرمایا' چنانچہ طے کر لیا گیا کہ آئندہ سے امیر تنظیم کے تمام دروس کے پروگرام اسی مقام پر منعقد کئے جایا کریں گے کیونکہ یہاں ہر مکتبۂ فکر کے لوگ اس انقلابی دعوت سے بلا کسی روک ٹوک کے فیض یاب ہو سکتے ہیں۔ امیر محترم کے حالیہ دورۂ کوئٹہ کے دوران دوروزہ خطاب جو کہ "حقیقتِ ایمان" کے موضوع پر تھا مذکورہ بالا آڈیٹوریم میں رکھا گیا۔ آڈیٹوریم کی دستیابی کے لئے ہمارے ایک بزرگ رفیق جناب چوہدری محمد یوسف صاحب کا ذکرِ خیر نہ کرنا بڑی ناانصافی ہوگی موصوف سابق ایم بی آر اور ایڈووکیٹ جنرل بلوچستان کے عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اب بھی پریکٹس جاری رکھے ہوئے ہیں۔ موصوف نے ذاتی دلچسپی لے کر مقامی امیر کی حسب ہدایت سیکرٹری تعلیم بلوچستان سے ملاقات کر کے اس آڈیٹوریم کو پروگرام کے لئے بغیر کسی معاوضے کے حاصل کر لیا۔

امیر محترم کے حالیہ دورۂ کوئٹہ کے لئے تین بڑے بڑے بینرز بنوائے گئے جو کہ شہر کی پرہجوم جگہوں پر آویزاں کئے گئے' مزید برآں دورے سے تین روز قبل روزنامہ "جنگ" کوئٹہ میں پروگرام کا اشتہار دیا گیا۔ اس کے علاوہ دس ہزار ہینڈ بلز چھپوائے گئے جن کو دورے سے ماقبل جمعے کے بعد شہر کے مختلف علاقوں اور جامع مساجد میں تقسیم کیا گیا۔ الغرض دورے کی پبلسٹی کے لئے ساتھیوں نے ہر ممکن کوشش کی۔ مرکز سے ناظم اعلیٰ تنظیم اسلامی جناب محمد نعیم صاحب دورے سے ایک روز قبل ہی تشریف لا چکے تھے جنہوں نے ہمیں دورے کے لئے مفید ہدایات سے نوازا۔ امیر محترم مورخہ ۱۰ر اکتوبر کو بوقت پونے دو بجے دوپہر کوئٹہ پہنچے۔ ایئرپورٹ پر ان کے استقبال کے لئے مقامی امیر جناب اکرام الحق صاحب' جناب میاں محمد نعیم صاحب اور جناب خاور قیوم صاحب موجود تھے۔ امیر محترم کی رہائش کا انتظام اس مرتبہ ہمارے بزرگ رفیق جناب چوہدری محمد یوسف صاحب کے گھر پر تھا۔ تمام رفقاء کو ہدایت تھی کہ عصر کی نماز چوہدری صاحب کی رہائش گاہ پر ہی ادا کریں گے تاکہ امیر محترم کے ساتھ تمام رفقاء کی ملاقات ہو جائے۔ نماز عصر امیر محترم کی اقتداء میں پڑھنے اور اُن کے ساتھ ملاقات کرنے کے بعد رفقاء درس کے سلسلے میں اپنی اپنی ڈیوٹیوں پر روانہ ہو گئے۔

نمازِ مغرب کے ساتھ ہی وہ لمحہ آ گیا تھا کہ جب ایمانیات کے موضوع پر سیر حاصل گفتگو ہونی تھی۔ پروگرام کا آغاز راقم الحروف کی تلاوت سے ہوا۔ ٹھیک پونے سات بجے امیر محترم نے درس کا آغاز فرمایا۔ حاضری تقریباً چار صد کے لگ بھگ تھی پہلے دن امیر محترم نے

ایمانیات کے ذیل میں بنیادی مباحث کا آغاز فرمایا جن میں ایمان کے لفظی معنی' ایمان کا اصطلاحی مفہوم' ایمان کا موضوع مابعد الطبیعاتی مسائل' ایمانیات ثلاثہ' توحید' معاد اور رسالت کا باہمی ربط' ایمان مجمل اور ایمان مفصل' ایمانیات ثلاثہ کی تقابلی اہمیت اور ایمان کے دو درجے قانونی ایمان اور حقیقی ایمان بڑے ہی دلنشین انداز میں بیان فرمائے۔ اگرچہ اس گفتگو کا ہر ہر موضوع اپنی جگہ بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ لیکن اس سلسلے کی سب سے اہم بحث ایمانیات ثلاثہ کا باہمی ربط اور ان کی تقابلی اہمیت اور ایمان کے دو درجے جس میں قانونی ایمان اور حقیقی ایمان اپنی افادیت کے لحاظ سے بڑی ہی مؤثر محسوس ہوئی۔ جس سے نہ صرف آج کل کی جدید اسلامی ریاست کے بڑے بڑے عقدے حل کرنے کی رہنمائی ملتی ہے بلکہ سلف صالحین میں ہمارے دو معتبر بزرگوں کی ایمان کے سلسلے میں مختلف آرا کی خوبصورت انداز میں تطبیق بھی ہو جاتی ہے۔

امیر محترم نے قرآن وحدیث کی روشنی میں فرمایا کہ فکری ونظری اعتبار سے اصل اہمیت ایمان باللہ کی ہے جبکہ ایمان بالرسالت اور ایمان بالمعاد اس کی دو شاخیں ہیں۔ قانونی وفقہی اعتبار سے اصل اہمیت ایمان بالرسالت کی ہے جبکہ عمل کے اعتبار سے اصل اہمیت ایمان بالمعاد کو حاصل ہے۔ بندۂ مومن کی سوچ وفکر کے دھارے کو بدلنے اور اُس کے عمل کی درستگی کے لئے ایمان بالمعاد مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔ اسی طرح قانونی اور حقیقی ایمان کے ضمن میں امیر محترم نے فرمایا کہ اس دنیا میں کسی شخص کے مسلمان ہونے کے لئے صرف اتنا کافی ہو گا کہ وہ زبان سے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اقرار کرے اور کوئی ایسا عقیدہ نہ رکھتا ہو' جو اسلام کے بنیادی عقائد سے متصادم ہو۔ اس سے اسلام کے قانونِ وراثت اور اسلامی ریاست میں ایک کامل شہری کی حیثیت سے جتنے فوائد ہیں وہ اُس کو حاصل ہوں گے کیونکہ قانونی طور پر وہ مسلمان ہے چاہے فاسق ہو یا فاجر ہو جبکہ آخرت کے اعتبار سے صرف زبان سے اقرار کافی نہیں ہو گا بلکہ اُس کا دارومدار اُس کے حقیقی ایمان پر منحصر ہو گا۔ امیر محترم نے سلف صالحین میں دو معتبر بزرگوں امام ابو حنیفہؒ اور امام بخاریؒ کی ایمان کے بارے میں مختلف آراء کو تطبیق دیتے ہوئے فرمایا کہ اصل میں امام ابو حنیفہؒ بنیادی طور پر ایک فقیہ تھے جن کی نظر ایمان کے قانونی پہلوؤں پر زیادہ تھی جبکہ امام بخاریؒ ایک محدث تھے جن کی نظر ایمان کے حقیقی پہلوؤں پر تھی۔ اس طرح ان دونوں بزرگوں کی ایمان کے بارے میں مختلف آراء کو بڑے ہی خوبصورت انداز میں تطبیق دی گئی۔ پہلے دن کی نشست جو کہ تقریباً اڑھائی گھنٹے جاری رہی۔

بڑے ہی دلنشین انداز میں ایمانیات کی بنیادی مباحث کا احاطہ کیا گیا۔ دعا کے بعد نماز عشاء ادا کی گئی جس کا انتظام کالج کے لان میں کیا گیا تھا۔ حسبِ پروگرام رفقاء کا کھانا اور رات کا قیام مقامی امیر جناب اکرام الحق صاحب کے گھر پر تھا۔ رفقاء نے رات کا کھانا امیر محترم کے ساتھ مقامی امیر کے گھر پر تناول فرمایا۔ رات کو شب بسری کے سلسلہ میں تمام رفقاء کا قیام اکرام الحق صاحب کے گھر ہی میں رہا۔

اگلی صبح نمازِ فجر کے بعد میاں محمد نعیم صاحب نے تنظیمی نوعیت کے کچھ پروگرام ترتیب دیئے تھے۔ جس میں نماز فجر کے بعد ہمارے ایک رفیق خاور قیوم صاحب کا آدھ گھنٹہ کا درس قرآن تھا جو انہوں نے بڑی عمدگی کے ساتھ دیا۔ ہمارے دوسرے سینئر رفیق سیّد برہان علی صاحب نے تنظیم اسلامی کوئٹہ کی مختصر تاریخ اور اس کا جائزہ بڑے ہی خوبصورت پیرائے میں بیان فرمایا۔ بعدازاں اجتماعی ناشتہ کے بعد رفقاء کے اندر اجتماعی شعور بیدار کرنے کیلئے اظہار خیال کا ایک پروگرام ہوا۔ جس میں ہر رفیق نے بڑے ہی سلیقے سے مقامی تنظیم کی رفتار کار کا جائزہ اپنے اپنے انداز میں پیش کیا۔ جس میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر خامیوں کی نشاندہی کی گئی اور تحدیثِ نعمت کے طور پر بحیثیت مجموعی خوبیوں کا ذکر بھی کیا گیا۔ بعد میں راقم نے متبدی رفیق کے مروجہ تربیتی نصاب کے ضمن میں کوئٹہ کے رفقاء کا گذشتہ دو ماہ کا فرداً فرداً جائزہ پیش کیا۔ تقریباً ساڑھے گیارہ بجے دن امیر محترم تشریف لے آئے۔ رفقاء نے اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے امیر محترم سے مختلف نوعیت کے سوالات کئے۔ جس کے جوابات امیر محترم نے تفصیلی انداز میں دیئے۔ ٹھیک سوا ایک بجے اجتماعی دوپہر کا کھانا چن دیا گیا۔ نماز ظہر کی ادائیگی اور آرام کیلئے امیر محترم جناب چودھری صاحب کی رہائش گاہ پر واپس تشریف لے گئے۔ دیگر رفقاء بھی شام چار بجے تک اپنی اپنی مصروفیات سے فارغ ہونے کے بعد دوبارہ مجتمع ہو گئے اور شام کے درس کیلئے تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔

ایمان کی اس دوروزہ بہار کا یہ دوسرا دن تھا جس میں حاضری گذشتہ روز سے زائد تھی۔ امیر محترم نے ایمان حقیقی یا یقین قلبی کے داخلی اور خارجی ثمرات اور ایمان کے اجزائے ترکیبی اور اُس کے حصول کے ذرائع بڑے ہی دلنشین اور خوبصورت انداز میں بیان فرمائے۔ امیر محترم نے فرمایا کہ اگر بندۂ مومن کو ایمان حقیقی کی دولت حاصل ہو جائے تو اُس کے تین ثمرات اُس کی شخصیت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ پہلا تو داخلی ثمرہ ہے جس میں بندۂ مومن کو ذہنی اطمینان اور قلبی امن و سکون ملتا ہے اس کے علاوہ دو خارجی ثمرات ہیں جس کے لئے امیر محترم نے

قرآن وحدیث کے بیشتر حوالہ جات سے ثابت کیا کہ خارج میں ایک تو اُس کا عمل درست ہو جاتا ہے اور دوسرا اُس کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے کہ صاحبِ ایمان شخص جہاد فی سبیل اللہ کی کٹھن منزل پر دل وجان سے گامزن ہو جاتا ہے۔ ایمان کے اجزائے ترکیبی اور حصول کے ذرائع کی وضاحت کرتے ہوئے سورۃ الحجرات کی روشنی میں آپ نے فرمایا کہ حقیقی ایمان کی موجودگی میں مومن کا ایمان اللہ اور رسولؐ پر پختہ ہوتا ہے اور پھر وہ شک میں نہیں پڑتا اور ساتھ ہی اپنے مال اور جان کو جہاد فی سبیل اللہ میں لگاتا اور کھپاتا ہے۔ یعنی ایمان کے اجزائے ترکیبی دو ہیں ایک اللہ اور رسولؐ پر پختہ یقین اور دوسرا جہاد فی سبیل اللہ۔

آخر میں امیر محترم نے انجمن خدام القرآن کوئٹہ کے قیام کے سلسلے میں اس کا تعارفی جائزہ پیش کیا۔ جس کے لئے فوری طور پر جناب چودھری محمد یوسف صاحب کو اس کا کنوینر مقرر کیا گیا اور ساتھ ہی لوگوں کو اس کے دستور کے مطالبہ اور اس میں شرکت کی ترغیب وتشویق دلائی۔ انشاء اللہ جلد ہی کوئٹہ میں بھی انجمن خدام القرآن کی ایک باقاعدہ ذیلی شاخ کا افتتاح ہو جائے گا۔ دعا کے بعد جن لوگوں نے جلد ہی جانا تھا اُن کیلئے ایک علیحدہ نماز عشاء کی جماعت منعقد کی گئی۔ جبکہ آڈیٹوریم ہال میں پروگرام کے مطابق سوال وجواب کی نشست کا پروگرام جاری رہا۔ جس میں امیر محترم نے درس سے متعلق اور دیگر تنظیمی نوعیت کے سوالات کے تسلی بخش جوابات دیئے۔ آخر میں دعا کے بعد نماز عشاء ادا کی گئی۔ دو حضرات جنہوں نے تقریباً پندرہ بیس روز قبل بیعت نامہ فارم پر کئے تھے، باقاعدہ طور پر امیر محترم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس کے علاوہ ایک نئے صاحب نے اگلے روز چودھری محمد یوسف صاحب کے گھر پر جا کر سمع وطاعت فی المعروف کی بیعت کی۔ دورے کے تیسرے روز یعنی ۱۲ر اکتوبر کو صبح گیارہ بجے امیر محترم کو بلوچستان ہائیکورٹ بار کونسل سے خطاب فرمانا تھا۔ الحمدُ للہ امیر محترم نے استحکام پاکستان اور موجودہ سیاسی صورتحال پر بڑی سیر حاصل گفتگو کی۔ جس سے ہماری وکلاء برادری کافی مطمئن نظر آتی تھی۔ بعد ازاں کچھ سوال وجواب اور ہلکی پھلکی چائے کے بعد یہ پروگرام بھی اختتام پذیر ہوا۔ اس کے بعد امیر محترم چودھری صاحب کے ساتھ ہمارے رفیق خاور قیوم صاحب کے ہاں دوپہر کا کھانا کھانے کے لئے تشریف لے گئے۔ کھانے اور نماز سے فراغت کے بعد جناب میاں محمد نعیم، مقامی امیر جناب اکرام الحق صاحب، جناب خاور قیوم صاحب اور راقم الحروف نے امیر محترم کو رخصت کیا۔ اس طرح ایمان کی بہار کے اس سہ روزہ پروگرام نے ایک مرتبہ پھر کوئٹہ کے شہریوں کو بالعموم اور مقامی رفقاء کو بالخصوص ایمان کی حرارت بخشی۔

مرتب: قاری شاہد اسلام بٹ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا

اے ہمارے رب، اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں تو (ان گناہوں پر) ہماری گرفت نہ فرما۔

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ

اور اے ہمارے رب، ہم پر ویسا بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے اُن لوگوں پر ڈالا

عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا

جو ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ

اور اے ہمارے رب، ایسا بوجھ ہم سے نہ اٹھوا جس کے اُٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے۔

وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا

اور ہماری خطاؤں سے درگذر فرما، اور ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔

اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝

تو ہی ہمارا کارساز ہے۔ پس کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔

ہمیں توبہ کی توفیق عطا کر دے

ہماری خطاؤں کو اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لے

عطیہ اشتہار

میاں عبد الواحد

نگوان سٹریٹ، پرانی انار کلی، لاہور

Jawad

We are manufacturing and exporting ready made garments [illegible] of kinds including shirts, trousers, blouses, [illegible] uniforms, hospital clothing, [illegible] aprons, bedlinen, cotton bags, textile [illegible]

For further details write to :

M/s. Associated Industries (Garments) Pakistan (Private) Ltd.,
IV/C/3-A (Commercial Area),
Nazimabad,
Karachi - 18
Tele : 610220/616018/625594

MONTHLY
Meesaq
LAHORE

Regd. L. No. 7360
VOL. 37 No. 11
NOVEMBER 1988

نبی اکرمؐ کی اصل جلالتِ قدر اور عظمتِ شان کو
کوئی نہیں جان سکتا، مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے کہ

"بعد از خدا بزرگ توئی قصّہ مختصر"

ہمارے لیے اصل قابلِ غور مسئلہ یہ ہے کہ:۔
کیا ہم آپؐ کے دامن سے صحیح طور پر وابستہ ہیں؟
اس لیے کہ اسی پر ہماری نجات کا دار و مدار ہے

اِس اھمْ مَوضُوع پر

ڈاکٹر اسرار احمد کی مختصر لیکن نہایت مؤثر تالیف

نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے

ہمارے تعلّق کی بنیادیں

کا خود بھی مطالعہ کیجیے اور اس کو پھیلا کر تعاون علی البر کی سعادت حاصل کیجیے

هدیہ فی نسخہ: چار روپے۔ تبلیغی مقصد کے لیے یک صد نسخوں پر ۳۳ فی صد کمیشن دیا جائے گا: